خواب پھر خواب ہیں

روگی
زینہ، زات کا سفر اور میں
شکستِ شب
وہ ایک بات
مرجینا

از

رفعت سراج

خواب پھر خواب ہیں

از

رفعت سراج

ناول کا آغاز

معاملہ کچھ اتنا عجیب و غریب تھا کہ عقل کام نہیں کرتی تھی کہ مجھے تو اپنے بھائی میاں بھی جان سے زیادہ عزیز تھے اور چھوٹے ماموں بھی۔

میرے دو ہی بھائی ہیں۔ ان کے بدع میرا نمبر ہے۔ میرے بعد مجھ سے چھوٹی ملیحہ کا۔ ہم دونوں کو بھائیوں اور ماموں کی شادی کا اتنا ارمان تھا کہ شاید ان تینوں کو بھی نہ ہو۔

سامنے بنگلے میں نئے لوگ آ تھے۔ ان کی دو بیٹیاں تھیں۔ بلا کی حسین، قابل رشک، صحت مند اٹھان والی۔ مہ پارہ جنہیں سب پارو باجی کہنے لگے تھے۔ ان سے چھوٹی سارہ جو تقریباً میری ہم عمر تھی۔ ان لوگوں کا آنا جانا ہوا تو عادات و اطوار ذات پات کے پردے ہٹے۔ ہم ماں بیٹیاں جو جوتے چٹخا چٹخا کر بیزار ہو چکی تھیں ان پر مر مٹیں۔ ابھی یہ بات دل ہی میں تھی کہ بھائی میاں نے دبی زبان میں امی جان سے فرمایا کہ وہ بڑی پر پوری جان سے فریفتہ ہو چکے ہیں (کہا تو بیچاروں نے بڑے سادہ انداز میں تھا) مگر انداز کچھ یہی تھا۔ ہم تو بہت خوش ہو۔

بھائی میاں تو چھوٹے ماموں کے ساتھ کار لے کر اڑ گئے۔ دونوں ماموں بھانجے میں دانت کاٹے کی دوستی تھی۔ چھوٹے ماموں بھائی میاں سے ڈیڑھ برس بڑے تھے۔ بلا کی ذہنی ہم آہنگی۔ این ایڈی یونیورسٹی میں بھی دونوں آگے پیچھے گئے۔ دونوں کے پاس الیکٹرونکس کا مضمون تھا۔ شام کو ہمیشہ باہر نکلتے تھے۔ جوتا ہمیشہ چاند رات کو پہنتے تھے۔ امی جان بڑبڑاتی رہتی تھیں۔ فالتو پیسے ہیں خواہ مخواہ لٹا کر آتے ہیں۔ عید کے روز دونوں ایک کرمے میں بنتے سنورتے تھے۔ دونوں ہی بلا کے شوقین مزاج ہی۔ ایک دوسرے پر پھبتیاں کسنا، چھیڑ خانیاں کرنا۔ ایسے ایسے مذاق کرتے کہ دوسرے مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ شیر جیسا چوڑا چکلا جسم اس پر غضب کی ڈریسنگ۔ بالوں کے اسٹائل امی جان تو نظر بھر کے دیکھتی بھی نہیں ہیں۔

چھوٹے ماموں کی پیدائش کے چھ ماہ بعد نانی جان مکان ابدی میں جا بسیں۔ تو ہمکتے ماموں خالہ صاحبہ کی گود میں آ گ۔ جو سترہ برس کی بیاہی ہوئی تھیں۔ اور ایک بیٹی کی ماں تھیں۔ امی جان کا بھی سولہ کا سن لگا تھا۔ سگے ماموں کے ہاں نکاح ہوا تھا۔ نانی جان کے انتقال کے بعد نانا جان نے فوراً رخصتی کر دی۔

امی سے چھوٹے عاصم ماموں ان دنوں آٹھویں میں پڑھ رہے تھے۔ چھوٹے مامون کو ویسے بھی ان کے بڑے کہتے کہ وہ ہمارے نانا نانی کے بڑھاپے کی بھول ہیں۔ نانی جان ہزار کہتی تھیں کہ تیرہ برس کی بیاہی گئی تھی۔ بڑھاپا نگوڑا کہاں سے آ مرا۔ مگر سب موقع ملتے ہی ان سے ٹھٹھول کرنے سے باز نہ آتے تھے۔ آہ میری ان دیکھی نانی جان۔۔۔

خالہ صاحبہ کا سسرال پنڈی میں تھا۔ کراچی وہ خالو صاحب کی ملازمت کی وجہ سے مقیم تھیں۔ کراچی کا گھر تھا۔ ماں کے مرنے کے بعد باپ کے کہنے پر چھوٹے ماموں کی وجہ سے بھی میکے آ بسیں۔ یوں فردوس بجیا اور ماموں کی ساتھ ساتھ پرورش کی۔ یہی وجہ تھی کہ چھوٹے ماموں کو وہ اولاد کی طرح عزیز رکھتے تھے بلکہ فردوس بجیا اسد بھائی، صمد بھائی پر فوقیت دیتی تھیں۔

فردوس بجیا صرف چار پانچ ماہ بڑی ہیں۔ مگر چھوٹے ماموں کو چھوٹے ماموں ہی کہتی ہیں۔ مگر رعب خوب جماتی ہیں۔ چھوٹے ماموں تو لوگ انہیں اس طرح کہتے ہیں گویا ان کا پیدائشی نام ہو۔

رہے بھائی میاں سے چھوٹے یعنی ہمارے عرفان بھائی بیچارے بڑی ایمانداری سے ڈاکٹری پڑھ رہے ہیں۔ اب تو خیر پریکٹس پر ہیں۔ جتنے خوبصورت ہیں۔ اس سے کہیں زیادہ سنجیدہ۔ عید کے روز امی جان خصوصی طور پر سارا کو سامنے لائیں۔ اور شارہ کر دیا کہ اسے تمہارے لیے پسند کرتے ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ بلیو جھلمل کرتے کرتے پائجامے اور چوڑے دوپٹے میں سارہ اتنی حسین لگ رہی تھی کہ میرا بس نہ چلا فورا بھابھی بنا لیتی۔ (تصوراتی تو بنا لی تھی) حسن کا کرشمہ تھا کہ نصیب کی بات عرفان بھائی جیسے، مفتی مولوی نے اثبات میں گردن ہلانے میں دیر نہیں لگائی۔

امی جان نے اشارے کنایوں میں واضح تو کر دیا تھا کہ وہ لڑکیوں کو اس نظریے سے پسند کرتی ہیں۔ اپنی بڑی بہن کے مشورے کے بعد ان کے ہمراہ باقاعدہ رشتہ مانگیں گے۔ اسی وجہ سے پارو اور سارہ اب شاذ و نادر ہی آتی تھیں۔ چھوٹے ماموں کوئٹہ گئے ہو تھے۔ بھائی میاں کے دن بور گزر رہے تھے۔ آتے جاتے جھلاتے۔

یار چھوٹے ماموں چیک کر ہی رہ گئے۔ حد ہو گئی۔

عرفان بھائی کے پاس جاتے۔ یار میری چھٹیاں ہیں بوریت ہو رہی ہے۔ چلو ذرا پرنس ہو آتے ہیں۔ بنا کپنی لطف ہی نہیں آتا۔

عرفان بھائی زاہد خشک کا سا جواب دیتے۔ بھائی میاں مجھے تو آج اپنے ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ ڈاکٹر اظفر کے ہاں ضروری کام سے جانا ہے۔

میں پیچھے سے ٹکڑا لگاتی۔

بھائی میاں پارو کو لے جائیں۔

وہ گھوم کر مجھے خشمگیں نظروں سے گھورتے مگر مجھے سو فیصد یقین ہوتا کہ سارے راستے جھومتے جائیں گے۔ نام ہی ایسا لے دیا تھا میں نے۔

خالہ صاحب ایک روز آئیں تو امی جان نے بات کی۔ بہت اچھی لڑکیاں ہیں۔ آپ نے تو دیکھی ہیں ناں؟

خالہ صاحبہ چپ سی ہو گئیں۔

عائشہ پارو کے لیے تو میں بھی سوچ رہی تھی۔

آپ۔۔۔؟ امی جان اور میں دونوں حیران ہو کیونکہ اسد اور صمد کافی چھوٹے تھے۔

ہاں۔۔۔ نواز کے لیے۔۔ (یعنی چھوٹے ماموں کے لئے)

اس مرتبہ امی جان چپ ہو گئیں۔ پھر گویا ہوئیں۔

باجی آپ تو سوچ رہی تھیں۔ مجھے تو خود عثمان (بھائی میاں) نے کہا ہے۔ عرفان سے میں نے خود بات کی تھی۔

تو ایسا کرتے ہیں۔ پارو، نواز کے لیے مانگ لیتے ہیں۔ اور سارہ عثمان کے۔۔۔

بہت عجیب بات ہے اب باجی جبکہ عثمان نے خود اپنے منہ سے پارو کے لیے کہا ہے۔ اسے وہ ممانی کی صورت می کیسے قبول کر سکے گا۔ اب یہ باتیں لڑکوں کے کانوں میں پڑ چکی ہیں۔ اور نواز کے لیے تو آپ طاہرہ خالہ کی بیٹی کے لیے کہہ رہی تھیں۔

امی جان کا لہجہ سنجیدہ ہو گیا۔

وہ تم میں کہہ رہی تھی۔ نواز کی کیا خبر تھی۔

کیوں اسے کیا ہوا۔۔؟ امی جان کے تر پائی کرتے ہاتھ رک گئے۔

وہ بھی پارو کے لیے کہہ رہا ہے۔

ہائیں۔۔۔ میں لرز گئی۔ امی سن رہ گئیں۔

اب بھلا ہمارے فرشتوں کو بھی کیا خبر تھی۔

تو اب تو خبر ہو گئی۔۔۔؟ خالہ صاحب نے امی کا چہرہ بغور دیکھا۔

مگر اب دیر ہو گئی ہے۔ اب تو ان لوگوں پر بھی سب کچھ عیاں ہے۔ کیا کہیں گے کہ کیا تماشہ ہیں ہم لوگ۔

کوئی کچھ نہ کہے گا۔ بیکار کا وہم ہے۔

باجی میں نے آپ کو ایک ایک بات بتا دی ہے۔ اس پر بھی آپ۔۔۔

اسے چھوڑو عائشہ لاکھ تمہارا وہ بھی بھائی ہے۔ مگر تمہیں اتنی نہ ہو گی جتنی مجھے ہے۔ اولاد سے بڑھ کر سمجھتی ہوں۔ میں تمہاری جگہ ہوتی تو ذرا اگر مگر نہ کرتی۔

مگر باجی بچے جو ایک دوسرے یک لیے سوچ چکے ہیں کیا منہ رکھیں گے سامنا کرنے کا ایک دوسرے کا۔

غلطی تمہاری ہی ہے کیوں وقت سے پہلے بچوں کے سامنے تذکرہ کیا۔۔؟ تمہیں تو آج تک بھائی کی آئی ہی نہیں۔۔ ایک مرتبہ تم سے کہا تھا کہ طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ کچھ دنوں کے لیے آ جاؤ۔ بچوں کے پاس ذرا نواز کی بھی طبیعت اچھی نہیں تھی۔ مگر تم نے کیسا کورا جواب دیا تھا کہ تم خود بحال ہو۔۔۔

غلط تو نہیں کہا تھا۔ ان دنوں عرفان ہونے والا تھا۔ بلڈ پریشر نے عاجز کر دیا تھا۔ سارے ہاتھ پیروں پر ورم تھا۔ جھک کر پاؤں کی جوتی تو ٹھیک نہیں کر سکتی تھی۔ بچے کیا سنبھالتی عثمان خود دادی کے پاس رہتا تھا۔ آپ کو ساری بات کا پتہ ہے۔ پر بھی آپ ہزاروں مرتبہ مجھے اس بات کا طعنہ دے چکی ہین۔ امی جان کی آواز بھرا گئی۔۔ (ہا میری سادہ سی ماں)۔

تمہیں خود گوارا نہیں کہ پریاں سی لڑکیاں گنوا دو۔

خالہ صاحبہ اپنے تیکھے مزاج ک وجہ سے جلد برہم ہو جاتی تھیں۔ خالہ جان چلی گئیں مگر ماحول بہت کھنچا کھنچا سا کر گئیں۔

امی نے ہمیشہ کی سی دوستانہ فضا میں ابا جی اور بھائیوں کے سامنے معاملہ رکھ دیا۔ ابا جی نے کہا کہ میں کیا بولوں۔ ایک تمہارا بھائی ہے۔ دوسرا بیٹا، وہ تو بری الذمہ ہو گئے۔

بھائی دونوں خاموش رہے۔

مگر علیحدگی میں بھائی میاں نے ازخود درشتگی سے کہا۔ پہلے میں کہہ چکا تھا۔ امی جان آپ سے۔۔۔

لرکی نہ ہوئی ریلوے کا ٹکٹ ہو گیا۔ کہ پہلے میں آیا تھا مجھے مل گیا۔ اور بڑی مصیبتوں سے ملا کہ کسی بھی قیمت پر دوسرے کو دینے پر تیار نہیں۔

مگر بیٹا۔۔

اگر مگر کچھ نہیں امی جان اگر ایسی کوئی بات تھی تو چھوٹے ماموں کو چاہیے تھا کہ مجھے بتا دیے۔

ایک ہی دفعہ تو ان کا سامنا ہوا تھا پارو سے پچھلی عید پر۔۔

بیٹا۔۔ وہ سارہ۔۔

اسے تو آپ نے عرفان کے لیے منتخب کیا تھا۔ انہوں نے حیران نظروں سے ماں کو دیکھا۔

تو کیا ہوا۔۔؟

آپ کے لیے کچھ نہیں ہوا۔ جس لڑکی کو وہ ہونے والی بیوی کی نظر سے دیکھ چکا ہے۔ اسے میں بیوی بنا لوں۔ آپ کے لیے کچھ ہوا ہی نہیں۔۔۔ آخری الفاظ انہیں بڑبڑاہٹ کے انداز میں ادا کرنے پڑے۔

کیونکہ مجھ پر نگاہ پڑ گئی تھی۔

مجھے پارو پسند ہے۔ انہوں نے یہ جملہ اس طرح کہا جیسے کہہ رہے ہوں کیا امی جان میں اس لڑکی پر سو جان سے عاشق ہوں، ہزار جان سے مرمٹا ہوں، شاید پاس ادب تھا۔ ورنہ جملوں کی تو راشن بندی نہیں تھی۔ امی جان تو بزرگی سے کافی دور تھیں۔ دیکھنے والے ایک نظر میں عرفان عثمان کی بڑی بہن ہی سمجھتے تھے۔ جب ہی بھائی میاں اتنی باتیں بھی کر گئے تھے۔

ان کے جانے کے بعد امی جان سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھیں۔

پتہ چلا چھوٹے ماموں کوئٹہ سے واپس آ گئے۔ ہم ماں بیٹیاں راہ تکتی رہیں۔ وہ نہ آ کر دیے۔

امی اور ملیحہ تو کوئی مرتبہ رو دیں۔ میرا دل مردوں سے ملتا جلتا ہے۔ لہذا میں مضبوط رہی۔

شام کو خالہ جان فردوس باجی کے ہمراہ پھر آن دھمکیں اسی طمطراق سے۔

جانے کیا کیا باتیں ہوئیں۔ جب میں چائے لے کر گئی تو خالہ صاحبہ کہہ رہی تھیں۔

سوچنے کی کیا بات۔۔۔ سیدھے سبھاؤ میرے ساتھ نواز کا رشتہ لے کر چلو۔۔

عثمان نہیں مانتا۔۔۔

خواہ مخواہ تم نے اولاد کو سر پر چڑھایا ہے عائشہ مانے گا کیسے نہیں۔

باجی رشتوں کی نزاکت کا بھی تو خیال کریں ناں۔۔

تو تم کیوں نہیں کر لیتیں خیال۔۔ انہوں نے پاندان کھول کر کلیاں جھانکیں۔

بات بھی تو انصاف کی ہے۔ پہلے ہی ہمارے ہاں ان بچیوں کے رشتے کی باتیں ہونے لگی تھیں۔ ضرور نواز کے کانوں میں بھی پڑک ہوں گی۔

اے ایسا چھچھورا نہیں ہے نواز۔ خوب انصاف کی سوجھی۔ اندھا بانٹے ریوڑیاں اپنوں اپنوں

کو۔۔۔ بھائی بھائی ہے، بیٹا تو ہے نہیں۔ تم ماں ہو ہزار طریقوں سے اپنی بات منوا سکتی ہو۔

بیٹے کا طعنہ نہ دیا کریں۔ کیا کلیجہ چیر کر دکھاؤں کہ کتنا عزیز ہے۔ اس سیپوچھیں کیا کیا نہیں میں نے مانی کو سمجھایا۔ امی جارو ہانسی ہو گئیں اور میری طرف اشارہ کیا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

خالہ صاحبہ بڑی رعب داب والی ہی۔ امی جان کیا سب ہی ان سے دبتے ہیں۔

تو ھپر چل رہی ہو نواز کے رشتے کے لیے۔ انہوں نے پان کپیتے کا ایک کونہ موڑ کر دبتے ہو پوچھا۔

عثمان سے بات کر لوں۔

خالہ صاحبہ پھر بھڑک اٹھیں۔ عثمان بیٹا ہے تمہارا۔ پوچھنا ہے تو خصم سے پوچھو۔۔۔

وہ کچھ نہیں کہتے۔ چھوڑیے باجی نواز کا رشتہ لے جایئے۔ میں دونوں بچیوں سے دستبردار ہوتی ہوں۔ بھری پڑی ہیں زامنے میں لڑکیاں۔ امی روکھے لہجے میں کہہ کر پاؤن لٹکا کر چپل ڈھونڈنے لگیں۔

اری پگلی تم خود سوچو۔۔۔ عاصم بیوی بچوں یولے کر کویت میں سب بھول بیٹھا ہے۔ ابا میاں ضقیف ہیں۔ ماں ہمارے سر پر نہیں، نواز کا کرنے والا کون ہے۔ ہم دونوں کے سوا۔

خالہ صاحبہ امی جن کو روٹھتے دیکھ کر۔ بڑے شفیق لہجے میں دلار سے بولیں۔

امی جان چپ رہیں۔ حالہ صاحبہ وار فردوس باجی دوپہر کا کھانا کھا کر واپس چلی گئیں۔ مگر امی جان کو مستقل سوچوں میں غرقاب کر گئیں۔ اباجی سارا ماجرا سن کر بولے۔

چلو نواز ہی سہی۔

مگر بھائی میاں نے توانا کا مسئلہ بنالیا تھا۔ بولے۔

میں چھوٹے ماموں کو پارو کے بارے میں پہلے ہی بتا چکا تھا۔

چھوٹے ماموں بولے۔ اس نے مجھے سارہ کے بارے میں بتایا تھا۔

پیغام رساں کے سامنے بھائی میاں بھڑک اٹھے۔

لاحول ولاقوۃ۔ پارو اور سارہ کے نام ہم قافیہ بھی نہیں کہ سماعت کی کسر نکل آ۔

ایسے جنگ و جدل ہم نے پوری زندگانی میں نہیں دیکھے تھے۔ اپنے چاندان میں وہ بھی عورت کے پیچھے۔

ہمارے مفتی مولوی صلح جو امن پسند بھائی آگے بڑھے۔

چھوڑیں بھائی میاں دونوں پر خاک ڈایں۔ (لو بھئی انہوں نے تو خاک ہی ڈال دی)۔

جی نہیں۔۔۔ حق دار کو حق ملنا چاہی۔ ے چھوٹے ماموں نے میرے معاملے میں قدغن لگا کر سخت نازیبا حرکت کی ہے۔ انہوں نے چھوٹے بھائی کی ڈالی ہوئی خاک پھر اڑا دی۔

بڑے خالو تھوری دیر بعد واپس چلے گئے۔ پورے ایک ہفتہ بعد خالہ صاحبہ صمد کے ہمراہ آن وارد ہوئیں۔

اوئی کیامت ماری گئی ہے ہماری جھٹانک بھر بچیوں کے پیچھے دل میلے کرتے پھریں۔ نواز بولا

باجی می نے نام رکھا تھا انتخاب کو، عاشقی کا اعتراف تو نہیں کیا تھا۔ آپ خواہ مخواہ آپا جانی پر برہم ہوئیں۔ سومنتوں سے مجھے بھیجا ہے۔ اس نے۔

خو کیوں نہیں آیا۔ کمینے کو اتنے دن ہو گئے۔ کوئٹہ سے آئے ہو شکل نہیں دکھائی۔ امی چھوٹے ماموں کو یاد کر کے رو پڑیں۔ واقعی ان کے گھر میں داخل ہوتے ہی در و دیوار مسکرا اٹھے تھے۔

اسکالر شپ ملا ہے ناں اسے، باہر جانے کی تیاریوں میں لگا ہوا ہے۔ وہاں سے آ گا تو تبھی شادی کریں گے اس کی۔۔۔

باہر۔۔؟ امی کو جیسے دھکا لگا۔

کورس پورا کرے آ جا گا۔ دونوں باتوں میں لگ گئیں۔

میرا دل ترپ رہا تھا۔ چھوٹے ماموں کو دیکھنے کے لیے۔ میں خالہ صاحبہ کے ہمراہ گھر آ گئی۔

سیڑھیاں پھلانگ کر ان کے کمرے میں پہنچی۔ تو وہ کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔

مجھے دیکھ کر مسکرا۔ سفید کرتے پائجامے میں۔۔ آستینیں چڑھا اتنپیارے لگ رہے تھے۔ میں اپنے ماموں پر نثار سی ہو گئی۔

اتنے دنوں سے گھر کیوں نہیں آ؟

بس پڑھائی میں الجھا ہوا تھا۔ آخر سمسٹر تھا ناں پچھلے دنوں۔ وہ ایک انجینئرنگ کالج میں میتھ پڑھا رہے تھے۔

پہلے بھی آ جاتے تھے آپ۔ امتحانوں میں۔ میں ان سے جانے کیا اگلوانا چاہ رہی تھی۔

بھائی میاں سے آپ کی اتنی پکی دوستی ہے۔ پھر بھی ان سے ناراض ہیں۔۔۔ وہ تو بالکل ناراض نہیں ہیں۔

تو آیا کیوں نہیں۔۔ وہ؟ انہوں نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

مجھ سے جواب نہ بن پڑا۔

صفو گڑیا دوستی تو آزمائشوں کے بعد ہی پتہ چلتی ہے۔ ایک دوسرے کی من پسند باتیں کرنا، خوش رہنا اور رکھنا ذہن ہم آہنگی۔ ضروری نہیں کہ یہ چیزیں دل میں بھی جگہ بنا لیں۔ مثال کے طور پر تم کہو کہ تمہیں نیلا رنگ پسند ہے اور یہ رنگ مجھے بھی پسند ہے۔ میں بیاختیار کہہ اٹھوں گا کہ مجھے بھی اور تم اپنی پسند کی قدر افزائی جانو گی۔ محترم سمجھو گی۔ اگر فان کلر پر میں تم سے اختلاف کروں تو تمہیں اپنی ہتک نہیں سمجھنا چاہیے کہ پسند اپنی اپنی ہے۔ یکساں پسند، ذہنی ہم آہنگی ہی دوست کی بنیاد نہیں۔ ایک دوسرے کی عزت کرنا، ایک دوسرے کی دل آزاری سیچنا اور دوسرے کے احساسات کا خیال رکھنا۔ یہ چیزیں اٹوٹ دوستی کی بنیاد ہوتی ہیں۔ وہ ایک تسلسل سے بولے گئے۔

میں چپ بیٹھی رہ گئی جو کچھ انہوں نے کہا میں سمجھ گئی تھی۔

بھائی میاں کا بات بات پہ جھلانا۔ بلاوجہ کاٹ کھانے کو دوڑنا ذرا سی غلطی پر زمین آسمان ایک کرنا ان کے کام آ گیا۔ ابا جی نے تو امی جان سے کہہ دیا تھا کہ اب اس گھر میں کسی کا رشتہ نہیں کرنا۔ نواز بھی گھر کا بچہ ہے۔ خواہ مخواہ دل برے ہوں گے۔ جب امی جان نے ایک اور لڑکی

سامنے رکھی تو بھائی میاں نہایت بیزاری سے بولے۔

امی جان نہیں کرنی مجھے شادی وادی۔ کوئی ضروری ہے کیا؟ آئندہ اس قسم کا تذکرہ بھی مت کیجیے گا میرے سامنے۔

امی کیا سب سمجھ رہے تھے کہ وجہ کیا ہے۔

فردوس بجیا کہ انہوں نے ہمیشہ بڑی بہنوں کا سا احساس دیا۔ انہوں نے ہی ابا جی سے جانے کیا باتیں کیں۔ وہ بولے۔

نواز مینے لیے عثمان جیسا ہے۔ فردوس بیٹا نواز سے کہو اگر وہ ناراض نہیں ہے تو گھر آ۔ تب ہی میں تم لوگوں کی بات مانوں گا۔

شام کو چھوٹے ماموں فردوس بجیا کے ہمراہ چلے آ، گرے قمیض شلوار نکھری نکھری سفید اسفنج کی چپلوں میں وہ پہلے جیسے چھوٹے ماموں نہیں تھے۔ چپ چاپ بے معنی سی مسکراہٹ سجا۔۔۔

بھائی میاں اوپر سے نہیں اترے حالانکہ میں چا دینے کے بہانے انہیں جتا آئی تھی کہ چھوٹے ماموں نیچے بیٹھے ہیں۔ خدا معلوم جھجک رہے تھے یا۔۔۔

البتہ چھوٹے ماموں نے قطعی نہیں پوچھا کہ عثمان کہاں ہے؟

جیسا کہ میں نے کہا کہ ان کا جھلانا چیخنا کام آ گیا پھر زیادہ مزاحمت نہیں ہوئی۔ ہم خالہ صاحبہ، امی جان، ابا جان، فردوس باجی باقاعدہ رشتہ نے کر گئے۔ اپنے دونوں بھائیوں کا۔

پارو کی امی اور پاپا نے ایک ماہ بعد جواب دینے کو کہا۔ امید قوی تھی کیونکہ وہ ہم ذات وہ ہم پلہ تھے۔ پھر رشتے بھی ڈاکٹر، انجینئر کے۔۔۔ اور۔۔۔ سال ڈیڑھ سال کی ہمہ وقتی پرکھ تھی۔

ادھر ہاں ہوئی ادھر ہم نے آفت اتار دی کہ نزدیکی تاریخ دیں۔

ہمارے گھر میں ہنگامے اتر آ۔ بریاں تیار ہو رہی تھیں۔ بازاروں کے چکر، گانوں کا ذخیرہ، جن جن سہیلیوں کے بھائیوں کی شادیاں ہوئی تھیں۔ ان کے ہاں سے سب گانوں کا ذخیرہ سمیٹ لا۔ دلہنیں بھی سامنے ہی تھیں۔ میں اور ملیحہ مٹ میں ادھر منٹ میں ادھر۔ ہمارے گھستے ہی وہاں شور مچ جاتا۔

ندیں آ گئی ہیں۔ چھپا دو۔۔۔ چھپ جاؤ۔۔۔ دروازہ بند کر دو۔ خواب اہم شخصیات بن گ ء۔

ان دنوں ہم لوگ خوب دلچسپ ہنگامے تھے،

مایوں کی رسم کے دن جب دونوں بھائیوں کو برآمدے میں کھینچ کر لایا گیا۔ بس سے غیر حالت ہمارے مولوی بھیا کی تھی۔

اے بھئی، ان خواتین کی رسموں میں ہمارا کیا کام۔۔۔؟ وہ بوکھلا۔

اجی واہ خواتین اپنی بھی رسمیں بھگتائیں اور آپ کی بھی۔ فردوس بجیا لال دوپٹہ کھولتے ہو ہنسیں۔۔۔ کتنے نفلوں کا ثواب۔۔۔؟ وہ پھر ہنسیں۔

بھائی میاں تو اپنی فطرت کے مطابق خوب شوخ ہو رہے تھے۔ مگر چھوٹے بھائی کی ہتھیلی پر مہندی رکھی جانے لگی تو وہ ہاتھ جھٹک کر بولے۔

کیا واہیات شے ہے۔ یہ خواتین کے لیے ہے۔

جی ہاں۔ ۔ ۔ جتنی بھی دنیا میں ناپسندیدہ چیزیں ہیں سب خواتین کے لئے ۔ خالہ صاحبہ انہیں دبوچتے ہو بولیں۔ ارے بیٹا ایک منٹ کی بات ہے۔ اتنی آسانی سے سہرے تک رسائی نہ ہوگی۔ ادھر جا کر دیکھو۔ ۔ ۔ سارہ کا تو برا حال ہوگیا ہے۔

جی۔ ۔ ؟ چھوٹے بھائی بری طرح بوکھلا۔

جی۔ ۔ ابٹن مل مل کے۔ خالہ بولیں چھوٹے بھائی بری طرح جھینپ گئے۔ قہقہوں سے شیڈ اڑتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

بھائی میاں نے خوب خوب حصہ لیا۔ مگر چھوٹے بھائی جلد ہی رسیاں تڑا کر بھاگے۔

بارات سے ایک روز قبل جب دونوں کے ابٹن ملنے کا ارادہ کیا۔ ۔ ۔ اور ان کے کمرے میں پہنچے تو وہ جم غفیر کو دیکھ کر گویا ہو۔

اس خوفناک شے کو میرے پاس بھی نہ لایے گا۔ میں نے شادی کے لیے ہاں کی تھی کھال کھنچوانے کے لئے نہیں۔ انہوں نے برش اٹھا کر بالوں میں پھیرا۔ اچھا بھلا اجلا رنگ ہے۔ اور وہ مجھے اسی روپ میں پسند کر چکی ہے۔

چھوٹے بھائی جو کوچ میں سہے دبکے دھنسے ہو تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اب طوفان کا رخ ان کی جانب ہوگا۔ بوکھلا کر بولے۔

مجھے بھی۔ ۔ ۔

ہائیں۔ ۔ تمہیں بھی پارو نے پسند کرلیا۔ پھر سارہ کا کیا کریں۔ ۔ ۔ ؟ فردوس باجی مصنوعی پریشانی سے بولیں۔ تو چھوٹے بھائی سٹپٹا کر رہ گ ء۔ ہم ہنس ہنس کر بیحال ہوگئے۔ اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ کر باہر آ گ ء۔

چھوٹے ماموں کا پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ کہاں ہیں۔ خالہ صاحبہ سے پوچھا تو ایک ہی جواب آج ضرور آ گا۔ کل کام تھا۔ مجھے اپنے بھائی میاں سخت خودغرض محسوس ہو تھے۔ اپنی خوشیوں میں بالکل گم ہوگئے تھے۔ جب بھائی میاں اور چھوٹے بھائی بن سنور کر سہرا بندی کی رسم کے لیے کھڑے ہو تو چھوٹے ماموں براؤن تھری پیس سوٹ میں خوبصورت بالوں کا دلکش اسٹائل بھرپور چال کے ساتھ ہار لیے بھانجوں کی سمت بڑھے۔ ۔ ۔ میں بھائی میاں کے بازو سے چپکی کھڑی تھی۔

چھوٹے بھائی کے گلے میں ہار ڈال کر وہ بھائی میاں کی سمت بڑھے۔

یار میں تو منتظر تھا کہ میرا یار مجھے اپنی خوشی میں خصوصیت سے، اصرار سے مدعو کرے گا۔ مگر میرا یار تو بہت کینہ پرور نکلا۔ ماموں تو اسے یاد ہی نہیں آیا۔

ان کے منہ سے اتنا سن کر بھائی میاں کی جھجک وخفت مٹ گئی۔ انہوں نے ماموں کو زور سے لپٹا لیا۔ دونوں کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے۔ میرے دل کو پر اطمینان سچی مسرت حاصل ہوگئی۔ بلکہ سب ہی مطمئن ہوگئے۔ امی جان نے بیٹوں کے بجا پہلے ماموں کا چہرہ تھام کر ان کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ بعد میں بیٹوں کو۔

دو دو بھابیاں گھر میں کیا آئیں۔ میرے تو گویا حواس معطل ہوگ ءے۔ بھابیاں بھی وہ کہ

نگاہ نہ ٹھہرے۔ عورتیں مارے رشک کے دیکھتی رہ گئیں۔ پارو بھابھی تو ہمارے گھر آ کر بھی گھٹ کر روتی رہیں۔ امی جان نے پارو بھابھی کو گلے سے لگایا۔

بیٹا کون سا دور ہو میکے سے؟ کیوں جان ہلکان کرتی ہو؟ روتے نہیں بیٹا شاباش

میری امی، مشفق و محترم۔ اکہرے بند کی گوری گوری، سیاہ زیادہ سفید کم بالوں کی چوٹی، بسنتی سادہ ساری میں پتلے پتلے گلابی ہونٹوں سے چمکارتی ہوئی۔ مجھے پارو بھابھی و سارہ بھابھی پر رشک آیا جنہیں میری امی جسی ساس ملی۔

میں اور ملیحہ تو ازحد مصروف ہو گئے۔ ہر صبح ہر شام بھابیاں سنوارا کرتے۔ بھائیوں کو چھیڑا کرتے۔ چھوٹے بھائی گھریلو اتار چڑھاؤ پر یکساں مزاج رکھتے ہیں۔ نہ خوشیوں پر اچھلتے ہیں نہ رنج پر روتے ہیں۔ میں سارہ بھابھی کو تیار کر کے ان کے سامنے لاتی تو وہ مارے بہنوں کے لحاظ کے ایک وارفتہ سی نظر بھی نہ ڈالتے۔ البتہ بھائی میاں ہواؤں میں اڑ رہے تھے۔ اب تو انہیں یہ بھی یاد نہیں رہتا تھا کہ مجھے کالج سے پک کرنا ہے۔ چھوٹے ماموں آیا نہیں۔ آخر انہیں ان کی پسند ملی تھی۔ کیوں نہ سرشار ہوتے۔ خوب دعوتیں ہونے لگیں۔ ہم طفیلیوں میں شامل تھے۔ عجیب ہنگامہ پرور دن ہو چلے تھے۔

شادی کے دو ماہ بعد ہی عید آ گئی۔ امی جان نے گھر سنبھالا میں نے بھاوجوں کو سنوارہ۔ دونوں نے میرون ساڑھیاں باندھیں۔ میں نے نیچ بیٹھ کر ان کی میرون سینڈلوں کے فیتے کسے وہ بھی تو مجھے بیانہتا چاہتی تھیں۔ ہلکا سا زیور پہنایا۔ میک اپ کیا۔ اف وہ میری بھابیاں کم، کو قاف کی پریاں زیادہ لگ رہی تھیں۔ مگر ایک بات تھی۔ بڑی بھابھی ازحد کم گو ہو گئی تھیں۔ میرے سنوارتے ہاتھوں کو روک کر بس بھی کہہ دیا کرتی تھیں۔ مگر چھوٹی بھابھی اپنی ہنس مکھ طبیعت کے باوصف پوری کی پوری ہمارے نرغے میں ہوتی تھیں۔ مجھے سنجیدگی سے میک اپ کرنے دیکھ کر کئی مرتبہ کھلکھلا اٹھتی تھیں۔

اللہ۔ صفو تو تو مجھے پوری مسرت شاہین بنا کر چھوڑے گی۔ رات تیرے چھوٹے بھائی کہہ رہے تھے کہ یہ صفو سارا دن تمہارے منہ پر کوچیاں ہی پھیرتی رہتی ہے یا کوئی دوسرا کام بھی کرتی ہے۔۔۔ ہائیں۔۔۔ میں نے سخت برا مان کر کھٹاک سے فیس پاؤڈر کی ڈبیہ بند کی۔ گویا کہ میری اتنی محنت ان کے نزدیک کو چیان پھیرنے کے مترادف تھی۔

چھوٹی بھابھی میرا بگڑا ہوا منہ دیکھ کر کھلکھلا اٹھیں۔ پگلی وہ تم مذاق کرتے ہیں۔

دو ماہ تک تو میں نے اپنی بھابیوں کو گلاس تک اٹھانے نہ دیا۔ میں نے بھابیوں کو اتنی چاہت دی تھی۔ اتنا آرام دیا تھا۔ دونوں مجھے بھی بیانہتا چاہنے لگی تھیں۔ گرویدہ ہو گئی تھیں۔ ملیحہ تو بس پڑھائی ہی میں لگی رہتی تھی۔

کھانے کی میز پر میں نہ پہنچتی تو دونوں میں سے ایک مجھے ڈھونڈنے کھڑی ہو جاتی۔ مجھے یاد ہے انہی دنوں مجھے سخت بخار ہو گیا تھا۔ جس طرح دونوں نے میری تیمارداری کی تھی۔ مجھے اپنے مقدر پر رشک آیکا تھا کہ قدرت نے مجھے آئیڈیل بھابیوں سے نوازا ہے۔

انہیں دنوں چھوٹے ملکموں برلن چلے گ ء۔ میرے اندر کچھ ٹوٹ سا گیا۔ بلاشبہ مجھے اپنے

چھوٹے مامون بہت پیارے ہی۔ شادی کے بعد بھائی میاں کے کپڑے پھنسے پھنسے لگنے لگے۔ ان کا وزن بڑھ گیا تھا۔ پہلے سیز یادہ خوبصوورت ہو گئے تھے۔ چھوٹے بھائی کے چہرے پر بھی ایک مہبوت کر دینے والا نکھار آ گیا تھا۔ میں امی سے کہا کرتی امی بھائیوں کی نظر اتار دیا کریں۔ بھابیاں ہنس پڑتیں۔

واہ بڑے حسین ہیں تمہارے بھائی۔ صفو

محبت کے مقدر میں سکون نہیں ہے۔

محبت کے مقدر میں ٹھہراؤ نہیں ہے۔

باطنی جذبے چودھویں کے چاند کی طرح محبت کے جوار بھاٹے کا سبب بنتے ہیں۔

جہاں قرار ہے وہاں محبت نہیں۔ یعنی سیدھے سبھاؤ گزارا ہے۔

خالق کائنات ہی ذات لازوال و باکمال ہے۔

اور کسی کو کمال حاصل نہیں۔ میری خوشیوں و مسرتوں کو بھی کمال نہیں۔

محبت وہی تو نہیں جو عورت و مرد کے چاہنے کا نام ہو۔

محبت۔ ہاں جیسے میں چھوٹے ماموں سے کرتی ہوں۔

جیسے میں باپ بھائی، بھابیوں سے کرتی ہوں۔ ملیحہ سیکرتی ہوں۔

ایک شخص جو سب کو پیارا ہو اگر چوٹ دے تو سب ہی چاہنے والوں کو لگے گی۔ سب محبت کرنے والوں کو ان کا انجام یعنی ایک لرزتا کانپتا آنسو مل کر رہے گا۔ کوئی گرا دے کوئی چھپالے،

امی جان کے سامنے جانے کیا ذکر ہوا تو بولی تھیں۔

بیٹا باکمال صرف خدا تعالی ہے۔ انسان خوشیوں اور کامیابیوں پر کتنا گھمنڈی ہو جاتا ہے۔ حالانکہ اس میں کوئی نہ کوئی کمی موجود رہتی ہے۔ یہ کمی ہی تو خدا کی موجودگی کا احساس ہوتی ہے۔ خدا کی خاموش آواز ہوتی ہے کہ اے بندے اگر تجھے سب کچھ اپنی کوششوں کے بل بوتے پر ملا ہے۔ اپنی ذات کے عروج و رفعت کا تو خود ذمہ دار ہے۔ تو یہ باقی بچی ہوئی کمی پوری کر کے تو مکمل کیوں نہیں ہو جاتا؟

امی کے یہی الفاظ میری ڈھارس کا سبب ہیں۔

میں انسان ہوں۔ میری ذات سے منسوب کسی چیز کو کمال نہیں۔

مجھے گئے دنوں کی طرح مصروف رہنا چاہیے۔

مجھے اسی طرح ہنسنا چاہیے۔

ہوا یہ کہ آج پارو بھابھی کی سچی سگی سکھی آئیں۔

میں ہمیشہ کی طرح چا بنا کر لے کر گئی۔ وہ بیڈ روم ہی میں تھیں۔ میں ٹرے سے پردہ کھسکا کر اندر جانا چاہتی تھی کہ آواز آئی۔

پارو تو تو خوب خوش و مگن نظر آتی ہے۔ اور وہ بیچارہ دیواروں سے سر پھوڑتا ہے۔

ہونہہ۔۔۔ خوش۔۔۔ ساجدہ سب کچھ دولت و خوبصورتی نہیں ہوتی۔ کیا بتاؤں میں نے کتنی

مشکلوں سے خود کو اڈجسٹ کیا ہے۔ میری روح اداکاری کرتے کرتے تھک گئی ہے۔ سجو۔۔۔ وہ مہینے بھر کا وقفہ جو جواب دینے کے لیے مقرر تھا۔ اس وقفے میں ہمارے گھر میں کیا کچھ نہ ہوا۔ قسم سے میں نے تو صاف انکار کر دیا تھا۔ اور وسیم کا بتا دیا تھا۔ پاپا خوب گرجے۔۔۔ کہنے لگے مجھے گولی مار دیں گے۔ خود پھانسی چڑھ جائیں گے۔ مگر اس کنگلے مصور کو میرا رشتہ نہیں دیں گے۔ اور پھر ان لوگوں نے بھی آفت اتار دی تھی۔ کسی کو بھی زیادہ سوچنے کا موقع نہیں دیا۔ سجو۔۔۔ وہ تباہ ہو جاگا۔ اسے کہنا میں سب کچھ بھول چکی ہوں۔۔۔۔ بہت خوش ہوں۔۔۔

ان کی آواز بھرا گئی۔۔ دونوں کی پشت میری طرف تھی۔ میں آدھے پردے میں الجھی کھڑی تھی۔ ٹرے میں ہاتھ میں کانپی برت بج اٹھے۔ میرے قدم من من بھر کے ہو رہیت تھے۔ میں متوحش سی کھڑی تھی۔ بھابھی نے گھبرا کر میری شکل دیکھی۔ وہ سال بھر میں صفوشناس ہو چکی تھیں۔ ٹوٹتی آواز میں بولیں۔

چا۔۔ چالے آئیں۔۔ بہت بہت شکریہ۔۔ دیکھا سجو میری نند کتنی پیاری ہے۔۔؟ سجو مسکرا کر سر ہلا کر اخبار دیکھنے لگیں۔

میرے چہرے پر غیر ارادی سکوت و جمود تھا۔

آپ بھابی کی شادی میں شریک نہیں تھیں؟ میں نے پوچھا۔

میں پنڈی میں تھی۔ میرے بیٹے کی حالت خراب تھی۔ اس لیے باوجود کوشش کے آ نہ سکی۔ جس کا مجھے افسوس ہے۔

میں نے دل میں کہا۔ آپ سے زیادہ مجھے افسوس ہے کم از کم یہ باتیں جب ہی ہو جاتیں۔ بھرم رہ جاتے۔

اور اب۔۔ میری چپ سے بھابی ہولا کرتی ہیں۔

میرا دل پھوٹ پھوٹ کر رونے کو چاہتا ہے۔۔ مجھے بھائی میاں اور چھوٹے ماموں کی دانت کاٹی دوستی یاد اتی ہے۔ اپنے ماموں کے بےفکرے شوخ و شنگ قہقہے یاد آتے ہیں۔۔۔ آرہے ہیں۔

بھابھی متوحش نظروں سے مجھے دیکھا کرتی ہیں۔ وہ سب سمجھ رہی ہیں۔ میری تمام کیفیات۔۔ ان کی حالت خانہ جنگی کے ستا ہو فرمانروا کی سی ہے۔ جس کے خلاف تختہ الٹنے کی سازش کی گئی ہو۔ اور وہ سازش پکڑی گئی ہو۔ وہ بادشاہ جو سکون سے حکومت کر رہا تھا۔ احتیاط کرنے لگا ہو۔ جسے غداروں کا دھڑکا لگ گیا ہو۔

میری اچھی بھابھی لوگ ہتے ہیں۔ نندوں کی زبانیں ڈھائی ہاتھ کی ہوتی ہیں۔ مگر میری پیاری بھابھی مجھے اپنے گھر کی خوشیاں و سکون بہت عزیز ہے۔ ہمارا خاندان امن پسندوں کا ہے۔ میرے چھوٹے ماموں کی مثال سامنے ہے۔ مہینے دو مہینے۔۔۔ سال۔۔۔ دو سال گزریں گے۔ آپ کا اعصابی دباؤ خود بخود ختم ہو جاگا۔ آپ کو مجھ سے غداری کا دھڑکا ہے ناں۔۔ مگر۔۔۔ میں غدار نہیں ہوں۔۔۔

اختتام--------------------The End

مرجینا

از

رفعت سراج

ناول کا آغاز

میں شہر کا مشہور و معروف بیرسٹر ہوں۔ میری شہرت کی دو اہم وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ میں کامیاب بیرسٹر ہوں۔ دوسری وجہ شہرت یہ ہے کہ کثیرالازدواج ہوں میں۔

آپ یہ نہ سمجھ لیجیے گا کہ میں کوئی شوقین آدمی ہوں اور مجھے شادیوں کا بہت شوق رہا ہے۔ جی نہیں۔ ہرگز نہیں۔ دراصل میں جنم دن سے ہی تین عورتوں کے نرغے میں رہا ہوں۔ ماں کو دیکھ نہیں پایا۔ سنا ہے بھلی عورت تھی۔ بس ماں تو مجھے جنم دے کر حقیقی ٹھکانے سدھاری اور میں تین عورتوں، میرا مطلب ہے تین بہنوں کے نرغے میں آ گیا۔

سب سے چھوٹا تھا۔ تین بہنیں لاڈ اٹھانے میں کسر نہ چھوڑتی تھیں۔ دنیا میں اگر کہیں لاڈ بک رہے ہوتے یا یامیہ کرا پر مل رہے ہوتے تو مجھے یقین ہے وہ ادھار بھی مانگ لاتیں۔ بہرحال انہوں نے اباجی کے ساتھ مل کر میری تربیت پر بھی بہت محنت کی۔ انہی کی محنت شاقہ کا نتیجہ ہے کہ آج میں ایک معزز آدمی ہوں۔

رہی بیگمات کی بات تو اتنا بتا دوں میری طبیعت میں بیصبری اور برہمی و خودسری بہت ہے۔ والد مرحوم نے میری شادی اپنی بہن کی بیٹی کے ہمراہ کی۔ اس شادی پر میں پہلے ہی معترض تھا کیونکہ پھوپھی زاد ہونے کے ناتے میں انہیں خوب اچھی طرح جانتا پہچانتا تھا۔ بالکل اللہ میاں کی گا بلکہ موم کی ناک۔ جدھر چاہے موڑ دو۔ میں ایک سوشل آدمی تھا۔ بیوی بھی ایسی چاہتا تھا جسے محافل میں میری عزت رکھنا آتی ہو۔ مگر وہی ہوا جو اباجی نے چاہا۔ انوری بیگم، بیگم

عقیل بن کر میرے لان میں اتر آئیں۔ (مجھ ناچیز کو عقیل کہتے ہیں) مگر مجھ میں، ان میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ذہنی اختلافات کا کوئی شمار نہ تھا۔

مجھے ان سے خاص دلچسپی نہ تھی۔ وہ میرے ماتھے کے بل دیکھ کر بات کرتی تھیں۔ حد سے زیادہ بزدل۔ بہت دنوں تک وہ مجھے محویت سے دیکھا کیں۔ غالباً انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ اتنا پڑھا لکھا معزز انسان ان کا شوہر ہے۔ کیونکہ وہ خود اسکول سے آٹھویں جماعت سے اٹھ گئی تھیں۔

ایک بار خلوتی لمحات میں انہوں نے انکشاف کیا تھا آٹھویں میں حساب کا پرچہ رہ گیا تھا۔ ورنہ میٹرک کرنا کوئی مشکل بات تو نہیں تھی اور میں نے کمال ضبط سے چہرے پر آنے والے ہر ردعمل کو روکا تھا۔ کرنا خدا کا یہ ہوا کہ ان سے مجھے کوئی اولاد نہ مل سکی اور میں نے اسی بات کو ڈھال بنا کر دوسری شادی کا اعلان کر دیا۔ بیگم مجرم نہ ہوتے ہو بھی مجرمہ تھیں۔ ہو سکتا ہے روئی ہوں۔ مگر مجھ پر اظہار نہ کیا۔

میرے ایک استاد محترم تھے۔ نہایت قابل بیرسٹر۔ میں نے انہیں کے ماتحت وکالت شروع کی تھی۔ ہم دونوں کے درمیان دوستانہ روابط تھے۔ وہ میرے خیالات سے اور میرے گھریلو حالات سے واقف تھے۔ میں نے ان کے سامنے اپنا فیصلہ رکھا تو انہوں نے مجھے سمجھایا کہ اپنی ان ہی بیگم کو پسندیدہ روپ میں ڈھالنے کی کوشش کروں۔ میں نے انہیں باور کرا لیا۔ یہ اب مشکل ہے جبکہ میرے ہاں اولاد بھی نہیں ہے۔ اس طور میں دوسری شادی کرنے میں حق بجانب ہوں۔ میرے انداز میں قطعیت تھی۔

استاد محترم کافی دیر مجھے غور سے دیکھتے رہے پھر گویا ہوئے۔

میاں میری ایک بھانجی ہے۔ عمر بہت کم ہے۔ میری بہن کا انتقال اس کی پیدائش کے بعد ہو گیا تھا۔ میرے بہنوئی نے دوسری شادی کر لی تھی۔ اب صورت حال یہ ہے بچی سخت مشکل میں ہے۔ سارے گھر کا بار اس پر ڈال رکھا ہے۔ اگر میں یا میری والدہ اسے اپنے پاس لانا چاہتے ہیں تو میرے بہنوئی رضامند نہیں ہیں۔ تمہیں سالوں سے میں جانتا ہوں اور تمہاری شرافت و نجابت کا قائل بھی ہوں۔ روپیہ پیسہ خدا نے خوب دیا ہے۔ میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ اپنی بیوی کو طلاق مت دو۔ اور اگر چاہو تو میری بھانجی بہت موزوں ہے۔ نہایت ذہین و تیز فہم بی اے تک ہم لوگوں نے زبردستی تعلیم دلائی ہے ورنہ ان کا ارادہ نہیں تھا اسے پڑھانے کا۔ بہت خاموش طبع اور صلح جو ہے۔ اس سے بہتر ہے کہ اس کی ماں اسے بغیر دیکھے کہیں اٹھا پھینکے۔ تم موزوں آدمی ہو بلکہ میرے نزدیک موزوں ترین۔

استاد محترم نے بھانجی کی اتنی تعریف کی کہ میرا بس نہ چلتا تھا۔ ابھی دو بول پڑھوا لوں۔

مجھے استاد محترم پر پورا بھروسہ تھا۔ میں نے لڑکی دیکھنے کی ضد نہ کی۔ ان کے بقول تقدیر سے کہیں زیادہ اچھی شکل ہے۔

بڑی بہن میرے نزدیک ہی رہتی تھیں۔ میں نے انہیں باخبر کر دیا۔ وہ ہانپتی کانپتی آ پہنچیں۔ میری بیوی کے گلے لگ کر رونے لگیں۔ میں ان روتی بسورتی عورتوں کو دیکھ رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر انہیں ہوا کیا ہے۔

دیکھو عقیل۔۔۔ تمہیں میری جان۔۔۔

بس کیجیے آپا تباہ کر رکھی ہے میری زندگی۔ کوئی ضرورت نہیں قسم وسم دینے کی۔ اب یہ فیصلہ ہو چکا ہے۔ میں انہیں طلاق تو نہیں دے رہا۔ پورے گھر پر ان کا اختیار ہے۔ ماہانہ ہمیشہ ملے گا۔ پھر تکلیف کس بات کی ہے۔ میں بگڑ کر بولا۔

آپا نے دانشمندانہ انداز میں میرا جائزہ لیا۔ پھر ٹھنڈی سانس چھوڑ دی۔ گویا سپر ڈال دی۔ نکاح میں چند گنے چنے رشتے دار تھے۔ رخصتی دو ماہ بعد تک ملتوی کر دی گئی۔

اب میں نے نئے سرے سے اپنے ملبوسات کا جائزہ لیا۔ بڑے بیاہتمام لباس زیب تن کرتا تھا۔ اس عمرت کی سنگت میں تو قبل از وقت بوڑھا ہو چلا تھا۔ دلہن کے ملبوسات کے ساتھ ساتھ میں نے اپنے بھی کئی سوٹ جدید تراش خراش کے تیار کرا۔ طبیعت میں ایک عجیب سی سرشاری رچ بس گئی تھی۔

استاد محترم دو ماہ کے لیے فرینکفرٹ گئے تو ان کی ذمہ داریاں بھی میری جان ناتواں پر آ پڑیں۔

اور ایک روز جب تھا ہارا گھر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ ایک صاحب اندر داخل ہو۔ شکل سے اچھے گھرانے کے نظر آتے تھے۔ آتے ہی سلام کیا۔ انتہائی گرمجوشی سے، شاید معانقہ کرنا چاہتے ہوں۔ مگر میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

کہیے جناب کیسے تکلیف کی۔ میں نے کرسی پر ڈٹ کر پیشہ ورانہ اسٹائل میں دریافت کیا۔

پہلے تو یہ فرمائیے۔ آپ ہی عقیل درانی ہیں؟

جی صاحب، ناچیز کو عقیل درانی کہتے ہیں۔

آپ کا نکاح شیخ نورالزماں کی صاحبزادی عالیہ بیگم سے ہوا ہے؟

جی ہاں میں نے بہت دلچسپی سے ان محترم کو دیکھا۔

میں ان کا کزن ہوں۔

بڑی خوشی کی بات ہے۔ میری نظریں ان کا طواف کر رہی تھیں۔

اور آپ کا ہمدرد بھی۔ وہ مزید گویا ہو۔

جی میں چونک سا گیا ان کے لہجے پر۔

آپ غالبا پہلی بیوی سے عدم اتفاقی کی بنا پر دوسری شادی کر رہے تھے۔ مگر صاحب آپ ایک مصیبت سے نکلکر دوسری مصیبت میں گرفتار ہو چکے ہیں۔ غالبا آپ لاعلم ہیں کہ آپ کی منکوحہ کی بائیں ٹانگ میں نقص ہے جس کی بنا پر وہ چال میں توازن نہیں رکھ پاتیں۔ میں ان کا قریبی رشتہ دار ہوں اور آپ دونوں کا ہمدرد۔ چند دن قبل وطن آیا ہوں اور معلوم ہوا کہ آپ جیسے معزز آدمی کو دھوکا دیا گیا ہے۔ یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔

ویسے ثواب کا کام ہے۔ خدا آپ کو اس نیکی کا اجر عظیم عطا کرے۔ تھوڑی دیر بعد وہ حضرت مصافحہ کر کے چلے بھی گئے اور میں گم صم بیٹھا رہ گیا۔ گویا استاد محترم بھانجی کی محبت میں میرا بیڑا غرق کر گئے تھے۔ میں مارے افسوس کے اپنی کرسی پر سے نہ اٹھ سکا۔ جیسے میرا وجود بیجان ہو گیا ہو۔ میری نظروں میں استاد محترم کا شفیق و پروقار چہرا گھوم رہا تھا۔ خدایا کس پر اعتبار کیا جا؟

کیسے کسی کو پہچانا جا؟ کیا ہے یہ دنیا؟

مگر میں ہار ماننے والوں میں سے نہیں ہوں۔ بہت جلد بھڑک اٹھتا ہوں۔ میں نے بھی استاد محترم کو سبق دینے کی ٹھان لی۔

اپنی بیگم کو تمام بات بتا دی۔ ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا۔ خوش مت ہو جانا۔۔۔ وہ نہیں تو کوئی اور سہی ہمارے زمانے کی لڑکیاں تو لنگڑی نہیں۔

میں تو اپنے بیوقوف بنا جانے پر کچھ زیادہ ہی تپ رہا تھا۔ استاد کی قسمت اچھی تھی۔ ان کا کئی دنوں تک فون بھی نہ آیا، ورنہ اچھی خاصی تلخ کلامی ہو جاتی۔

جمعہ کو ضرورت رشتہ کے کالم کو بہت اہتمام سے پڑھتا تھا۔ ایک اشتہار میرے دل کو چھو گیا۔ خوبصورت و خوب سیرت، اعلی خاندان، امریکہ میں مقیم، عمر تقریبا تیس سال بیرون ملک قیام کی وجہ سے شادی میں تاخیر ہوتی رہی۔ اور جانے کیا کیا لکھا تھا۔ آخر میں تحریر تھا دوسری شادی کے خواہشمند بااولاد افراد بھی رجوع کر سکتے ہیں۔

اور میرے مشتعل و منتقم ذہن نے یہاں قسمت آزمائی کی ٹھان لی۔

میں استاد محترم کی آمد سے قبل یہ کام کر لینا چاہتا تھا۔

لڑکی کے بھائیوں اور ماں سے ملا۔ لڑکی سے ملاقات رہی۔ انتہائی خوبصورت و جامہ زیب۔ میرے ذہن سے انوری بیگم و عالیہ بیگم بالکل مٹ گئیں۔ میں نے سب کچھ انہیں سچ سچ بتا دیا۔ لڑکی کے بھائی میری صاف گوئی سے بیحد متاثر ہو۔ میں نے انہیں یقین دلایا میں دوسری

منکوحہ سے کوئی تعلق نہیں رکھوں گا۔ بس ان کے ماموں کا انتظار ہے۔

اور ایک شام روحینہ شکوہ، روحینہ عقیل بن کر میرے گھر آ گئیں۔ خالص حیدر آباد سے متعلق ہیں۔ رخ اور طنطنہ نکاح میں بندھ کر میرے ہمراہ آیا ہے۔ شروع میں ان کے رخ سے میں بڑا پریشان رہا۔

شادی کے اولین دنوں میں انہوں نے کسی وجہ سے مجھے پکارا۔

بخیل صاحب

اور میں شیو بناتے بناتے تپ کر رہ گیا تھا۔ بخیل صاحب ہونہہ حس مزاح بری چیز نہیں مگر یہ کیا کہ بخیل صاحب ٹھیک ہے زمانہ طالب علمی میں ابا جی کے عطا کردہ محدود جیب خرچ کی وجہ سے میں دوستوں کی مدارات سے اجتناب برتتا تھا جس بنا پر وہ مجھے بخیل کہہ دیا کرتے تھے۔ مگر ان کے پاس کیا کمی چھوڑی ہے۔۔۔ آخر شوہر ہوں۔ وہ بھی ملازموں کے سامنے۔۔۔ بخیل صاحب۔۔۔ حد ہو گئی صاحب

میں بولی کن خیالوں میں گم ہیں بخیل صاحب وہ اس بار بلند آواز سے بولیں۔

ہت ترے کی۔ میں کھسیا کر رہ گیا تھا۔ اب تو ان سے اور ان کے رخ سے سمجھوتہ ہو چلا ہے۔

روحینہ شکوہ انٹر پاس تھیں۔ بس طرحدار بہت تھیں انگریزی پر عبور رکھتی تھیں۔ مگر بہت کوشش کے باوجود اردو ان کی حیدر آبادی آغوش میں ہی رہتی تھی۔

ٹھیک اس شادی کے ڈیڑھ ماہ بعد استاد محترم وطن واپس لوٹ آئے۔

میری یہ شادی مکمل خاموشی سے ہوئی تھی۔ ابھی باہر اسکی ہوا نہیں لگی تھی۔

میں بہت سرد مہری سے استاد صاحب سے پیش آیا۔ انہوں نے واضح طور پر محسوس کیا۔ ان کا ردعمل ان کے احساسات کا مظہر تھا۔ کافی دیر بعد میں نے کہنا شروع کیا۔

عباد صاحب مجھے کس قدر دکھ ہوا یہ جان کر کہ آپ جیسی معزز ہستی بھی کسی کو دھوکہ دے سکتی ہے۔ اور اب میرے لیے ناقابل برداشت ہے کہ میں آپ کے ہمراہ کام کرو اگرچہ مجھے بہت افسوس ہے مگر میں مجبور ہوں۔ مگر تھوڑی سزا آپ کا حق بھی ہے۔ میں عالیہ بیگم کے طلاق کے کاغذات تیار کر کے پوسٹ کر دوں گا۔

کیا کہہ رہے ہو۔۔۔ میاں۔ [illegible]؟ وہ بے اندازہ پریشان ہو گئے تھے۔

میں ایک تعلیم یافتہ بیوی مسلم اعضاء کے ہمراہ چاہتا تھا۔ ورنہ میری پہلی بیوی عادت کی بری نہیں۔ نہ ہی اپاہج ہیں۔ میں نے آپ پر واضح کر دیا تھا کہ میں دوسری شادی شوقیہ نہیں حالات کے تقاضوں سے مجبور ہو کر کر رہا ہوں۔ بہرحال جو ہونا تھا ہو چکا۔ میں شادی کر چکا ہوں۔۔۔

اور۔۔۔ عالیہ بیگم۔

کیا کہہ رہے ہو بھئی۔ صاف صاف بات کرو۔ استاد محترم کا چہرہ شدت جذبات سے سرخ ہو رہا تھا۔ میں طنزیہ مسکرایا۔۔۔ اور کیا صفائی باقی ہے۔۔۔؟

اور عباد صاحب تمام ماجرا سن کر سر ہاتھوں میں تھام کر بیٹھ گئے۔۔۔ ان کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

میاں، تم جیسے پڑھے لکھے بردبار آدمی سے مجھے اس قدر جذباتیت کی توقع نہیں ہو سکتی تھی۔

وہ بچی واقعی بدنصیب ہے۔ ان کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ میاں، کم از کم میرے آنے کا تو انتظار کیا ہوتا۔

اور جو کچھ عباد صاحب نے بتایا سن کر میرا دل بیٹھنے لگا۔

انہوں نے بتایا کہ وہ نوجوان جو میرے پاس آیا تھا وہ عالیہ کا طلبگار رہا تھا مگر اس کا اٹھنا بیٹھنا غلط لوگوں میں تھا، اس لیے انکار کر دیا گیا تھا۔ یہ اس کی انتقامی کاروائی تھی۔

لمحے بھر کو تو میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔

اور اس قدر خفت و ذلت اور شرمندگی میں نے محسوس کی کہ خود کو شوٹ کر دینے کو جی چاہا۔

میں نے استاد محترم کے پاؤں چھو کر معافی مانگنا چاہی تو میری آواز بھرا گئی۔

مگر عباد صاحب کو ایک چپ سی لگ گئی تھی۔ وہ تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد یہ کہہ کر چلے گئے۔

کاش میرا کوئی بیٹا ہوتا تو شاید یہ بچی اس قدر دکھ نہ اٹھاتی۔

اور اس روز میں صرف آنسو پیتا رہا۔ ایسا لگتا تھا میرے دائیں جانب انوری بیگم ہاتھ اٹھا بددعاؤں کے انگارے برسا رہی ہیں اور بائیں جانب عالیہ کا آنچل پھیلا ہے اور اس کے آنسو نہیں رکتے۔

گھر آ کر میں بہت بے چین رہا۔ روحینہ میرا جائزہ لیتی رہیں۔ دوسری رات بھی جب انہوں نے یہی منظر دیکھا تو رہا نہ گیا۔

میں بولی۔۔۔ وخیل صاحب خیر خیریت تو ہے نا۔ کوئی بڑا مخدمہ ہے کیا؟ (وکیل صاحب خیریت تو ہے۔ کوئی بڑا مقدمہ ہے کیا؟)

میں نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ سبز ریشمی ساڑھی تھی اور خوبصورت تر و تازہ چہرے پر تشویش تھی۔

ان کی ناک ہیرے کی لونگ سے بیحد سج رہی تھی۔ وہ میرے سامنے ایک غمگسار ساتھی کی طرح کھڑی تھیں۔ میری ہمت نہیں پڑتی تھی انہیں حقیقت حال کہنے، بتانے کی۔۔۔ بار حال عیاں تو کرنا تھا۔

وہ میری آنکھوں میں تیرتا پانی دیکھ کر سخت ہراساں ہو گئیں۔

اصل بات بتائیں۔ میں بڑی پریشان ہو رہی ہوں۔ بول دی؟؟؟ انہوں نے تیکھے پن سے کہا۔

اور میں نے اصل بات بتا ہی دی۔

آس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ ان کے رشتہ داروں کی لگائی آگ ہے۔ آپ کی جگہ پو کوئی ہوتا یہ آج کرتا۔۔۔ دیونصیبیاں ماری کو طلاخ۔۔۔ فخر کی کیا بات ہے۔ (فکر کی کیا بات ہے)

روحینہ بیگم عالیہ بیقصور ہے۔ میں نے انہیں احساس دلایا۔

مطلب کیا ہے آپ کا، بیقصور ہے۔ گھر لے آئیں اسے۔۔۔؟ اچھی طراں سمجھ لیں، آپ سے طلاخ دیں گے۔۔۔ اللہ ماری میری جان پو کیوں عذاب ہو؟ میں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے؟

--ممیں بابا--سیدھے سیدھے طلاخ بولو۔

نہیں ہوگا ہم سے برداشت۔ ہا میری دکھیا جان کن عذابوں میں پڑ گئی۔

پیچھے سوکن---آگے سوتن---

انوں کی بد دعا کا اتا خیال---میری جان جو آپ کی جان روئی گی---خدا کا خہر (قہر) نہ ٹوٹے گا اس گھر پو۔ وہ رونے لگیں۔

صورتحال خاصی سنگین ہو گئی تھی۔

اگلے روز آفس پہنچا تو نئی مصیبت سر پر کھڑی تھی۔ عالیہ کے والد طیش میں کف اڑا رہے تھے۔ عباد صاحب اور مجھ پر مقدمہ کرنے کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ اور فی الفور طلاق مانگ رہے تھے۔ وگرنہ دوسری صورت میں جلدی ہی وہ مجھ پر مقدمہ دائر کرنے والے تھے۔

باآواز بلند کہہ رہے تھے۔ آج ہی پرچی داخل کراتا ہوں میاں۔

میں نے صفائی پیش کرنے کی بہت کوشش کی مگر وہ کچھ سننے پر تیار نہ تھے۔

میں نے گھر آ کر روحینہ و انوری بیگم کو تمام بات بتائی۔ انوری بیگم تو مقدمے کا سن کر ہی رونے لگیں۔ روحینہ الگ خوفزدہ ہو گئیں۔ مگر عالیہ کو بھی کسی طور برداشت کرنے پر راضی نہ تھیں۔

کیونکہ میں نے شادی کے وقت کچھ نہ چھپایا تھا اس لیے روحینہ بیگم کا تو مجرم نہ تھا۔

اور پھر مجھے ہر لمحے سمن کا انتظار رہنے لگ۔ میں نے حالات کا سامنا کرنے کی ہمت پیدا کر لی۔

اور اگلے روز میں سخت منتشر ذہن کے ہمراہ آفس میں بیٹھا ہوا تھا۔

کہ چپڑاسی نے ایک سفید لفافہ لا کر دیا۔

میں نیالٹ پلٹ کر دیکھا۔ شاید میں عدالت کی مہر دیکھنا چاہتا تھا۔ مگر لفافے پر صرف میرا نام تحریر تھا۔ چپڑاسی نے بتایا کہ ایک بی بی دے گئی ہیں۔

میں نے ایک تذبذب کے عالم میں لفافہ کھولا۔

بڑی خوبصورت ہینڈرائٹنگ تھی۔

وکیل صاحب

السلام علیکم

خدا لازوال سے اپ کی صحت و عافیت کے لیے دعا گو ہوں۔

اس سے پہلے کہ آپ حیران ہوں تعارف کرا دوں اپنا۔ مجھے عالیہ بیگم بنت نور الزماں کہتے ہیں۔ مورخہ 21 جنوری کو میرا عقد آپ کے ہمراہ ہوا تھا اور اب میں آپ کی منکوحہ ہوں۔ میرے گھر والے آپ پر مقدمہ چلانے کے لیے مصر ہیں۔ میرا دل نہیں مانتا۔ آپ میری زندگی میں آنے والے پہلے اور آخری مرد ہیں۔ آپ کے ماضی سے متعلق جان کر بھی مجھے آپ سے منسوب ہو کر خوشی ہوئی تھی۔ اس لیے کہ مجھے امید نہیں تھی کہ میرے نصیب آپ جیسا باوقار انسان لکھا ہے۔ میں نے بچپن سے کچھ ایسا وقت گزارا ہے کہ بیان سے باہر ہے اور آپ

پر مقدمہ دائر کرنا گویا طلاق حاصل کرنا ہے۔ اور اب مجھے خوف آتا ہے کہ مطلقہ ہو جانے کے بعد خدا جانے میرا نصیب پھر کن کن آزمائشوں میں پڑتا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ میں اسی شخص کے ہمراہ رہوں جسے میرا دل و ذہن قبول کر چکا ہے۔ اور ظاہر ہے جب میں ایسا نہیں چاہتی تو مقدمے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ میرے یہ خیالات بیشک میرے والدین تک پہنچا دیجیے کیونکہ بہرحال میری حیا اس طرح گفتگو کرنے میں مانع ہے۔ مگر ان سے بھی میں مقدمہ دائر کرنے سے متعلق اختلاف رکھتی ہوں۔ میں نے قلم اٹھانے کی جرات صرف اس لیے کی ہے کہ موسم الم بدلتا نہیں تو پھر اس کی صورت ہی بدل جا۔ آپ کے وجود کے سامیں ہر الم منظور ہے۔

میں آپ کو قصوروار نہیں سمجھتی۔ شاید کوئی اور ہوتا تو اس سے زیادہ کر گزرتا۔ یعنی مجھے طلاق دینے میں لمحہ نہ لگاتا، بہرحال اب جو بھی کچھ ہوا ہے کم تو نہیں ہے۔ بہرحال۔۔۔

ناچیز۔ عالیہ

اور پھر میں۔۔۔ روحینہ بیگم کی طرف سے بالکل غافل ہو کر استاد مکرم کے دولت کدے پر حاضر ہوا۔ ان سے تفصیلاً بات چیت رہی۔ شب ایک بجے تک میں ان کے پاس رہا۔ رات ایک بجے کے بعد جب میں گھر پہنچا تو انوری بیگم پورچ میں کھڑی تھیں۔

آج بہت دیر ہو گئی؟ جیسے ہی میں گاڑی سے اترا انہوں نے تشویش سے پوچھا۔

ہوں۔ میں نے ان کی جانب دیکھا اور ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

بس کام زیادہ تھا۔ جاؤ۔ تم سو جاؤ اب۔ وہ چلی گئیں۔

میں اپنے کمرے میں آیا تو روحینہ پیشانی شکن آلود کیے ایزی چیئر پر دراز تھیں۔ گھر میں فون ہے۔ فون ہی کر دینا چاہیے۔ ہولتا ہے دل کہ خدا معلوم کیا جات ہے۔

ارے بھئی، معاملہ ذرا الجھا ہوا تھا بس دھیان نہیں رہا۔۔۔

کون سا معاملہ؟ عالیہ بیگم والا۔۔۔؟ انہوں نے گہری نگاہ سے مجھے دیکھا۔

اب کیا بکتے ہیں؟ تیکھے لہجے میں سوال آیا۔

کچھ نہیں۔ میں نے کچھ نہیں کے بعد بہت کچھ کہنا چاہا۔

اور پھر میں نے جو کچھ کہنا چاہا تھا کہہ دیا بہت محبت و عجز سے۔

مگر وہ بپھر گئیں۔ میں آپ کو کتا سمجھائی اوں کو فوراً اطلاع دیو۔۔۔ مگر۔۔۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔

سمجھ رناں آپ۔۔۔؟

مجھے ان سے اسی جواب کی توقع تھی۔

میں نے ان کے ہاتھوں کو تھام کر کہا۔ گنہگار میں ہوں۔ خطا کار میں ہوں۔ اگر میں نے طلاق دے دی تو ضمیر کے نیزے پر رہوں گا۔ میری سماجی و معاشرتی زندگی بری طرح متاثر ہوگی بلکہ شاید ہر وقت کے احساس ندامت سے میری دماغ کی رگ پھٹ جا گی۔

تم سب لوگ مجھے جی بھر کر سزا دو۔ میں زندگی بھر اس جلد بازی کا تاوان ادا کرتا رہوں گا۔ وہ آنا چاہتی ہے اسے قبول کر لو۔ وہ اور کچھ نہیں مانگ گی۔

اور پھر مجھ جیسے انا پرست آدمی نے روحینہ کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے کہ ضمیر کی آوازوں سے میرے اعصاب چیخ رہے تھے۔ روحینہ عورت تھیں۔ میری آنکھوں کا پانی ان کے دل میں اتر گیا۔

وہ کچھ نہیں بولیں۔ بس میرے سینے سے سر ٹکا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔ ظلم تو میرے ساتھ بھی ہو رہا ہے۔ میرے لیے آپ کا ضمیر کیا کہتا ہے؟

روحینہ میرا تم سے وعدہ ہے کبھی تمہاری حق تلفی نہ ہوگی۔ بلکہ شاید آج سے میرے دل میں تمہارا مقام بلند ہو جا۔

اپنے بھتیوں کو کیا بولوں گی۔ آپ کیا جواب دیں گے؟

تو کیا تم میرا ساتھ نہ دو گی۔

وہ خاموش ہو رہیں۔ بس میرے شانے سے لگی سسکیاں بھرتی رہیں۔

اور پھر عالیہ آ گئیں۔ وہ ضرورت سے زیادہ سمجھدار نکلیں۔ انوری بیگم اور روحینہ سے بصد احترام پیش آتیں۔ ان کی موجودگی میں مجھ سے ان کی بے نیازی کا عجیب عالم ہوتا۔

روحینہ شکوہ کو میں دو ہزار روپے ماہوار دیتا تھا۔ زمینوں کی آمدنی انوری بیگم کے پاس آتی تھی۔

عالیہ کو میں نے پہلی مرتبہ دو ہزار روپیہ دیا تو ڈیڑھ ہزار انہوں نے مجھے واپس لوٹا کر کہا۔ سب کچھ تو گھر میں موجود ہوتا ہے۔ گاڑی میں آنا جانا ہوتا ہے۔ وہ بھی کبھی کبھار۔ بس یہ کافی ہیں۔ موسم کے لحاظ سے کپڑے ہی تو بنانے ہیں۔ وہ بھی بس کتنے۔ ضرورت ہوگی تو لے لوں گی۔

میں نے اس بات کا تذکرہ روحینہ سے کرنا ضروری سمجھا۔

ہونہہ۔۔۔ مظلوم ہیں سدا کی۔ خرچ کرنا کیا جانیں اب نوٹوں کی بیڑیاں تو بنا کر پہننے سے رہیں۔

انہوں نے سر جھٹک کر حقارت سے کہا۔

پارٹیز میں زیادہ تر روحینہ ہی میرے ہمراہ ہوتی تھیں کبھی عالیہ کو کہتا بھی تو طرح دے جاتیں۔

سارے گھر کی ذمہ داریاں اپنے نازک کندھوں پر اٹھالی تھیں۔

مجھے وہ بات بھی اور باتوں کی طرح نہیں بھولتی جب انوری بیگم بیمار پڑ گئی تھیں۔ تب عالیہ نے کس دلجمعی سے ان کی تیمار داری کی تھی۔ ان کے لیے پرہیزی کھانا بنانا ان کی دوا کا دھیان رکھنا۔ اور شاید انہوں نے انوری بیگم کی توجہ و محبت حاصل کر لی تھی۔

حسن اتفاق سے میری سب سے پہلی اولاد عالیہ سے ہے۔ ان دنوں جب وہ ان اہم مہینوں سے گزر رہی تھیں۔ انوری بیگم نے ان کا بیحد دھیان رکھا۔ عالیہ کے کم آگے بڑھ بڑھ کر کیا کرتی تھیں۔

عالیہ کے چہرے پر چھائی زردی اور ان کے چلنے پھرنے میں تکلیف کا تاثر۔۔۔

انوری بیگم کی محبتوں میں چھپ جاتا تھا۔ یہ فضا میرے لیے سکون کا باعث تھی۔

اور اس کے لیے میں عالیہ کا ممنوں تھا احسان مند تھا۔

ان دنوں میں عالیہ کو دیکھتا تو اپنی جلد بازی کے کیے گئے فیصلے پر پچھتاتا رہ جاتا۔

جب وہ اس گھر میں آئی تھیں تو بیحد نازک سی تھیں۔ اب ان کا جسم بھاری ہو رہا تھا۔ اس سے ان کی دلکشی میں نہ سمجھ میں۔۔۔ آنے والا اضافہ ہو چلا تھا۔

وہ گھر میں بہت بے تکلف تھیں۔ انہیں کام میں مصروف دیکھ کر احساس تک نہ ہوتا تھا کہ وہ بٹواروں کی ستائی ہوئی ہیں۔

اور ایک روز مجھے بیٹے کی نوید ملی۔ میں بیانتہا خوش ہوا تھا۔

انوری بیگم عالیہ کے ہمراہ ہی تھیں۔ میں اور روحینہ اپنا بیٹا دیکھنے گئے۔ روحینہ نے کوئی تاثر نہیں دیا تھا۔ میں نے بڑی چاہ سے اس عظیم مراد کا نام مراد رکھا تھا اور وہ زیادہ تر اپنے بیٹے میں مصروف رہنے لگیں۔

اس کے بعد روحینہ کے ہاں بیٹی ہوئی۔

روحینہ سے میری دو بیٹیاں اور عالیہ سے ایک بیٹا اور بیٹی ہیں۔

میں عالیہ کو دیکھتا ہوں۔ مجھے وہ عورت کی عظمت کا آسمان نظر آتی ہیں۔

میرے بٹواروں میں شاید سب سے بڑا بٹوارہ، سب سے بڑا نیزہ انوری بیگم کے حصے میں آیا تھا۔ جس نے ان کا دل لہولہو کر دیا تھا۔ اور وہ لہو ان کے منہ سے گرنے لگا تھا۔

روحینہ بیگم نے بچوں پر پابندی لگا دی تھی کہ وہ بڑی امی کے پاس نہ جائیں۔

مگر عالیہ وہ لہو اپنے ہاتھوں سے سمیٹتی تھیں۔

ان کی تیمارداری کرتی تھیں۔ ان کا بستر بدلتی تھیں۔ کمرے میں ائیر فریشنر چھڑکنا تک یاد رکھتی تھیں۔ ان کے تکیے پر گلابوں کے گجرے سجاتی تھیں۔ صبح اٹھ کر ان کے کمرے میں دھوپ لگانے کا اہتمام کرتی تھیں۔ انہیں لان میں بٹھا کر ان سے باتیں کرتی تھیں۔

میں یہ سب دیکھتا تھا اور عالیہ کے بارے میں بہت کچھ سوچتا تھا۔

اور پھر۔۔۔ ایک روز میں آفس میں بیٹھا نئے کیس کی فائل دیکھ رہا تھا کہ فون کی گھنٹی چیخ پڑی۔

میں نے ریسیور اٹھایا۔ فون پر عالیہ تھی۔

عقیل صاحب باجی کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی تھی۔

اور میں اپنی جگہ ساکت رہ گیا۔ میں نے اعلیٰ پیمانے پر ان کا علاج کرایا اگرچہ تاوان کا ایک بڑا حصہ ان کے نام کر چھوڑا تھا مگر وہ تاوان کی حدود سے شاید گزر چکی تھیں۔

جن دنوں انوری بیگم کا انتقال ہوا میرے چاروں بچے کالجوں میں پہنچ چکے تھے۔

عالیہ تمام رسومات میں اس طرح مصروف رہیں جیسے انوری بیگم ان کی حقیقی بہن ہوں۔

میں نے کبھی انہیں ایک دوسرے سے کوئی دکھ کہتے نہیں سنا تھا مگر شاید یہ عورتیں ادراک کے پنکھ پر بیٹھ کر سفر کرتی تھیں۔ دنیا میں شوہروں کو اپنی بیویوں سے بہت سی شکایتیں ہو جاتی تھیں۔ مگر مجھے عالیہ کی کوئی ایسی بات یاد نہیں جو قابل گرفت ہو۔۔۔ عالیہ نے اپنی اچھائیوں سے روز بروز میرے ضمیر کا پھندا تنگ کیا ہے۔ ان کا ہر مرتبہ کا کوئی ایثار میرے قدموں تلے سے تختہ سرکا دیتا ہے اور میں دل پر ہاتھ رکھ کر پہروں سوچتا رہتا ہوں۔

اور جیسے آج ہوا۔۔۔ روحینہ سے میری دو بیٹیاں ہیں روشینہ اور رشنی اور عالیہ سے میرا پہلا بیٹا

اوراس سے چھوٹی تابندہ ہے۔

عالیہ کے رشتےداروں میں سے آج تابندہ کا رشتہ آیا تھا۔ عالیہ کو وہ لڑکا بیحد پسند تھا۔ اکثر ذکر کیا کرتی تھیں۔ مگر روحینہ ہتھے سے اکھڑ گئیں۔

تحمل صاحب آپ تو باپ ہیں۔ آپ کے لیے تو روشی اور تابندہ برابر ہونا چاہئیں۔ روشی بڑی ہے۔ اس کا حق ہے۔ کیا بدشکل یا لولی لنگڑی ہے میری بچی؟

روحینہ رشتہ تابندہ کا آیا ہے۔ منگنی کر دیتے ہیں۔ شادی ابھی نہیں کریں گے۔ میں نے سمجھایا۔

ہوں۔ اس طرح میری بچی کامپلیکس میں مبتلا نہ ہو جائے گی۔ کہ۔ ۔ ۔ وہ چڑ کر گویا ہوئیں۔

تحمل صاحب آپ کا وعدہ تھا آپ کبھی میری حق تلفی نہیں کریں گے۔ میرے بچوں کی حق تلفی بھی میری حق تلفی ہے۔

مگر یہ رشتہ عالیہ کے رشتہ داروں کی طرف سے آیا ہے۔ میں نے انہیں سمجھایا۔

اس ناتے سے وہ آپ کے بھی رشتہ دار ہیں۔ سب بچے آپ کے ہیں۔ ہم گرہ میں باندھ کر نہیں لاتے۔ بول دی میں نے

وہ کچھ سننے پر آمادہ نہیں تھیں۔

اس لمحے عالیہ نیپکن سے ہاتھ صاف کرتی اندر چلی آئیں۔

کوئی بات نہیں آپا ٹھیک ہی تو ہے۔ روشی بڑی ہے آخر۔ ہماری بڑی بیٹی ہے پہلے ہم اس کو

بیاہیں گے یہ تو کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے۔ بھائی میاں آئیں گے تو کہوں گی ان سے۔

میں اور روحینہ خاموش بیٹھے رہ گئے۔

اور میں اپنی جگہ پتھر سا ہو گیا۔ عالیہ بس کرو، بس کرو، اب تو پھندا شہ رگ کو چھونے لگا ہے۔ کتنی خوشی سے کل کہہ رہی تھیں۔

میں بہت خوش ہوں۔ کتنے اچھے لوگ ہیں۔ تابندہ ماشاءاللہ بہت قسمت والی ہے۔ اور اب کیا کہہ کر چلی گئی تھیں۔

میں روحینہ کے پاس سے اٹھ کر عالیہ کے کمرے میں آیا تو وہ تابندہ کے شانے پر ہاتھ رکھے اسے کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

اور میں بہت کچھ جان گیا۔ صرف عالیہ کی خوشی نہیں تھی بلکہ شاید میری پریوں جیسی بیٹی بھی۔۔۔

اور میرا جی چاہا آج سب سے لڑ کر عالیہ کو صرف اور صرف ایک خوشی دے ہی ڈالوں۔ مگر میں جانتا تھا وہ کبھی ایسا نہیں ہونے دیں گی۔

اس عورت کو شاید یہ نہیں معلوم اس کے ایثار۔۔۔ خاموشی اور امن پسندی کے ہاتھ دن رات میری آگہی، میرے ضمیر کے گلے پر رہتے ہیں۔

جب بھی میں اندر کے طوفانوں سے گھبرا کر عالیہ سے اپنی زیادتیوں پر پشیمان ہوتا ہوں تو وہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیر کر مسکرا اٹھتی ہیں۔ بڑی محبت سے کہتی ہیں۔

خدا نہ کرے آپ مجرم ہوں۔ گناہگار ہوں۔ ہو جاتی ہیں بعض اوقات غلطیاں۔ اللہ بڑا معاف

کرنے والا ہے اور میں اپنی چہیتی بیوی کو دیکھ کر رہ جاتا ہوں۔ ظالم۔۔۔۔ طعنے بھی تو نہیں دیتی۔۔۔ برا بھلا بھی تو نہیں کہتی۔

انوری بیگم تم خاموشی کے انگاروں کو میرا زادِ راہ بنا گئی ہو اور عالیہ۔۔۔

یہ مجھے علی بابا کی مرجینا نظر آتی ہیں جو میرے اعمال بلکہ سیاہ اعمال کے چالیس چوروں کو نیست و نابود کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔۔۔ اور میرے اعمال کے چور چالیس نہیں ہیں۔ وہ چالیس کو معافی کے خنجر سے فنا کرتی ہیں تو ان سے کہیں زیادہ سیاہ اعمال سرکش اور جان بچا کر بھاگنے والے چوروں کی طرح میرے وجود میں لوٹ مار مچانے لگتے ہیں۔

اور اس سمے میں کس قدر نڈھال ہو جاتا ہوں۔

کوئی دیکھے میرے تڑپنے کا منظر۔۔۔ جیسے مجھ پر سکرات کا لمحہ آن پہنچا ہو۔

اور جب یہ اندر کی لوٹ مار مجھے پاگل کر دیتی ہے تب میں دیوانہ وار عالیہ کے کمرے کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہوں۔ نئی زندگی پانے کے لئے۔۔۔ اس کمرے میں، صرف اس کمرے میں مجھے زندگی ملتی ہے۔ وہ میرا وجود پھولوں کی طرح سمیٹتی ہیں۔ میرا ضمیر جیسے ان کا سب سے چھوٹا لاڈلا بچہ ہے۔ وہ اسے محبت بھری آنکھیں دکھاتی ہیں۔ گویا کہتی ہوں کیوں ستاتے ہو۔

اور مجھے ایسا لگتا ہے وہ ان کی بات مان جاتا ہے۔ میں گویا موت کے منہ سے واپس آ جاتا ہوں۔ موت اور زندگی کا کھیل جاری رہتا ہے۔۔۔ کاش عالیہ مجھے طعنے دیا کریں حق تلفی پر چیخ چیخ کر رویا کریں۔ آخر یہ مرجینا کب تک تنہا میرے سیاہ اعمال کے چوروں کا سدباب کرتی رہے گی۔ کب تک۔۔۔؟

اختتام---------------------The End

وہ ایک بات

از

رفعت سراج

میڈا عشق وی توں۔۔۔

پٹھانے خان کی آواز کیسٹ پلیئر سے ابھر رہی تھی۔ خواجہ غلام فرید کی کافی نے دل کی عجیب کیفیت کردی تھی۔ حالانکہ وہ گھنٹہ بھر سے وارڈ روب کی حالت سنوارنے میں مگن تھی۔ آج چھٹی کے دن اس نے اس کام کا انتخاب کیا تھا۔

میڈا درد وی توں۔۔۔ درماں وی توں۔۔۔

ارے بھئی ذرا اس کی اواز آہستہ کرو تمہیں تم ریڈیو کی اونچی آواز سے خدا جانے کیا لطف محسوس ہوتا ہے۔ حد ہے خواہ سمجھ میں کچھ نہ آئے۔ وقار نے جھلا کر اخبار جھٹکا اور کروٹ بدلی۔

اتنی آہستہ تو آواز ہے اور پھر میری تو سمجھ میں آرہا ہے جو کچھ بھی آرہا ہے۔ آخر میرے بچپن کے دن سال ملتان اور بہاولپور میں شٹل کاک بن کر گزرے ہیں۔ وہاں کی مقامی لڑکیاں میری سہیلیاں تھیں۔ جس وقت ہم ملتان سے کراچی آئے۔ میں اچھی خاصی سرائیکی بول اور سمجھ لیتی تھی۔ بچوں کو ویسے بھی ماحولاتی زبان جلدی آجاتی ہے

اور پھر خواجہ فرید کی کافیاں تو مجھے بہت ہی پسند ہیں۔ ایک ایک لفظ دل کی رگ رگ چھوتا محسوس ہوتا ہے۔ اس کی آواز مدھم ہوگئی تھی۔ وہ اپنے کام میں پھر بھی بدستور مگن تھی۔

حافظہ تمہارا خاصا اچھا ہے۔

لہجہ۔۔۔ حساس ذہن۔۔۔ کے لیے ضرب بلکہ بھاری ضرب کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہر چند کہ اسے طنز سے زخمی کیا گیا تھا۔ اس نے پلٹ کر نہ دیکھا۔ شاید ہمت نہیں ہوئی۔ اس نے استعمال کے لیے دو دھلے ہوتو لیے ایک طرف رکھے اور آگے بڑھ کر پلیئر اسٹاپ کردیا۔

وقار نے سرسری نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر مسکرایا۔ سفید جھنڈا تھی۔ کوئی ناگواری کی لہر اس کے چہرے پر نہیں تھی۔ ڈھیلی ڈھالی چوٹی سے لٹیں نکل کر گردن پر قابض ہوچکی تھی۔ اسمارٹ سے وجود پر ملگجا لباس۔

کیسی فطری سی گھریلو عورت دکھائی دی تھی۔

ڈاکٹر سے چیک اپ کرالیا تھا۔ انہیں معا خیال آیا۔

کرالیا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے سب ٹھیک ہے۔ اس ہمدردی پر اس کا دل نہ جانے کیوں بھر آیا تھا۔

چھلکتی آنکھیں، ناک والوں کے لیے ذلت کا سبب ہوتی ہیں۔ اسی لیے اس نے باتھ روم میں گھس جانا مناسب خیال کیا۔

بس دلہن کیا بتاؤں قصد تو کیا تھا ملتان میں اترنے کا کہ چلو سمدھیانے میں سلام کرتے چلیں۔۔۔ مگر۔۔۔ توبہ اس بلا کی گرمی۔

کہ سارا جذبہ رشتہ داری بہہ گیا۔ اس کی نند نے شرارت سے ماں کی بات کاٹ دی۔

حد ہے بیہودگی کی۔ اماں جان کو بیٹی کے دخل در معقولات پر تاؤ آ گیا تھا۔

لاہور میں ایک بلا کی گرمی۔۔۔ اماں جان نے اپنے لہجے میں لاہور کی گرمی کی شدت سمو کر گویا بہو کی طرف منتقل کی۔

گویا آپ ملتان نہ جا سکیں؟

بتا تو رہی ہوں۔ وہ پھر شروع ہوا چاہتی تھیں۔

جی جی۔۔۔ اس نے جلدی سے کہا۔ مبادا۔ ذکر گرمی سے پھر شروع ہو جاو ہیں سے چھوٹا تھا۔

ارے بچہ نظر نہیں آ رہا؟ مع اہیں پوتے کا خیال آیا۔

ساتھ والوں کی نادیہ لے جاتی ہے شام کو۔ بہت خوش رہتا ہے اس کیساتھ۔

ارے دلہن اس طرح مت بھیجا کرو۔ ذرا سے بچے کو۔۔۔ برا وقت ہے۔ نادیہ بھی بچی ہے۔ ادھر ادھر کھیل میں لگ سکتی ہے۔

جی اماں جان بات یہ ہے کہ نادیہ کی ممی اسے باہر نہیں کھیلنے دیتیں۔ اس لیے وہ وقاص کو اپنے ساتھ لے کھلانے کے لیے لے جاتی ہے۔

اب بلواؤ بچے کو دلہن بہت دن ہو گئے دیکھے ہو۔

اچھا میں لاتی ہوں۔

تم۔۔۔

جی ساتھ ہی تو ہے۔ فاطمہ کو برتن دھونے سیکیا اٹھاؤں۔ اس کی نند غسل کے لیے اندر جا چکی تھی۔

وہ دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھ کر۔۔ ساتھ والوں کے ہاں چلی گئی۔ وقاص کو گود میں اٹھا کر

جب وہ باہر نکلی تو وقار گیٹ کے سامنے اپنی گاڑی سیاتر رہے تھے۔ غالباً ہارن کی آواز پر گیٹ تک کوئی نہیں آیا تھا۔ وقاص نے باپ کو دیکھ کر اس کی گود میں مارے خوشی کے ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔

وقت نے چونک کر بیٹے کی آواز کی سمت دیکھا۔

کم از کم سورج ڈھلنے کا انتظار کر لیا کرو اگر میرا نہیں کرتیں۔ اب سیر کرنے کا ایسا بھی کیا شوق۔ وہی سلگا کر رکھ دینے والا لہجہ۔۔۔

دراصل مجھے سورج میں جھلس کر سیر کرنے میں بہت مزہ آتا ہے، وہ جھپاک سے گیٹ پار کر گئی اور سیدھی کچن میں پہنچی۔ فاطمہ گیٹ کھول دو جا کر صاحب گاڑی اندر لائیں گے۔

یہ لیجیے اماں جان اپنا پوتا عرف رونے والا انجن۔ وہ ہنس کر ساس کے پاس بیٹھ گئی۔ اور ذکر تک نہیں کیا کہ ان کے صاحبزادے بھی تشریف لے آ ہیں۔

گڑیا بھابھی

اف سارہ بھابھی کیساتھ گڑیا تو نہ لگایا کرو۔ سچ بڑا عجیب لگتا ہے۔

آپ تو اب بھی گڑیا ہی لگتی ہیں۔ ایک بچے نے آپ کا کچھ نہیں بگاڑا۔

کیا واہی تباہی بکتی ہے لڑکی بچے بگاڑا کرتے ہیں۔

نہیں اماں جان بچے تو سنوار کرتے ہیں۔۔۔ جیون۔

تو اس میں شک بھی نہیں بچے تو عورت کا روپ ہوتے ہیں۔ بیاہتا عورت بچوں کے بغیر کبھی نہیں سجتی۔

کتنے سال کا ہو گیا۔۔۔ وقاص، دلہن۔۔

اس سال چھ اکتوبر کو دو سال کا ہو جا گا،

ماشاءاللہ اب اس کا کوئی اور بہن بھائی بھی ہونا چاہیے۔ اللہ رکھے دلہن۔۔۔ ویسے۔۔؟

وقار آ گ ہیں اماں جان اس نے جلدی سے کہا۔ مبادا وہ سارہ کے سامنے کیا کیا کہہ جائیں۔

ہائیں۔۔۔ تو کیا ہے؟ لو پہلے کیوں نہیں بتایا۔ کہاں ہے میرا بچہ؟

وہ واری صدقے ہونے کا پروگرام بنا کر اٹھنے لگیں تو وقار خود ہی چلے آ ۔

السلام علیکم اماں جان

جیتا رہے میرا بیٹا خدا عمر دراز کرے۔ انہوں نے پیشانی چوم کر ڈھیروں دعاؤں کا سلسلہ شروع کر دیا۔

آداب بھائی جان۔

انہوں نے بہن کے سر پر ہاتھ پھیرا اور محبت سے کمر تھپتھپائی۔

یہ آپ لوگوں کو پریشان ہونے کا وشق ہے۔ مجھے اطلاع کیوں نہیں دی۔

ارے اس سارہ کو شوق تھا کہ بھائی بھاوج کو حیران کروں گی اچانک جا کر۔ اس لڑکی کو بس یہی تماشے سوجھتے ہیں۔ ویسے تو تمہاری پھوپھی کا بیٹا وسیم ہمارے ساتھ تھا۔ ہمیں چھوڑ کر ہوٹل گیا ہے۔ وہ آ رہا تھا اپنے کسی دفتری کام سے۔ ہم نے سوچا چلو اسی کے ساتھ کراچی چلیں۔ اب سارہ کی بھی چھٹیاں تھیں۔

بہت اچھا کیا اماں جان میں تو آپ سے کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ آپ مستقل ہمارے ساتھ رہیں۔ لیکن آپ کو شاید۔۔۔

سوچتی تو میں بھی ہوں پھر بری دلہن کا خیال آتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ میرا اور سارہ کا سہارا رہتا ہے اسے، ویسے بھی سیدھی سادی ہے۔ تمہیں تو اپنے بھائی کا مزاج پتا ہے۔ بچوں میں مگن ہو کر اگر اس کے کام بھول جا تو وہ زمین آسمان ایک کر دیتا ہے۔ نمو (دلہن کی بہن) آئی ہوئی تھیں۔ تو ہم نے اور کا ارادہ کر لیا۔ پروگرام تو یہ تھا کہ ملتان ٹھہر کر آگے چلیں گے۔ مگر بھیا گرمی کی وجہ سے ہمت نہیں ہوئی۔

اماں نے بڑی تفصیل سے بیٹے کے شکوے کے جواب میں جواب شکوہ، ارشاد کیا تھا۔

دلہن تم مجھے بہت کمزور دکھائی دے رہی ہو۔ دشمنوں کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟

دشمن تو بہت خوش باش ہیں اماں جان بس ہم ہی۔

ارے نیک فال منہ سے نکالو دلہن دونوں وقت مل رہے ہیں۔ یہ تم نے اس کا کیا حال بنا رکھا ہے بیٹا وہ بیٹے سے گویا ہوئیں۔

یعنی میں نے؟ وقار ٹپٹا گئے۔

تو اور کیا بہت لا پروا ہو گئے ہو۔ کیا سر جھاڑ منہ پہاڑ سا حلیہ ہو رہا ہے اسکا۔ کیا اس طرح رہتی تھی یہ؟ وہ ناراضگی سے بولیں۔

جب دل خوش نہ ہو تو شاید انسان کا بننے سنورنے کو جی نہیں چاہتا۔ وہ بولے۔ ایک تیر تھا جو دل کے آر پار ہو گیا۔

تو خوش کیوں نہیں رکھتے اس کا دل؟ اور کون کرے گا اس کا خیال؟

ویسے اماں جان مجھے نہیں معلوم تھا۔ وہ پھر طنزیہ مسکرا۔

کیا؟ انہوں نے ادھر ادھر جھانک کر پوچھا۔ اری دلہن میری باسکٹ کدھر ہے۔ میرا پاندان ہے اس میں۔

کیا نہیں معلوم تھا؟ وہ پوری طرح اپنے بیٹے کی طرح متوجہ تھیں۔ باوجود پان کی طلب کے۔

یہی کہ اگر دوسروں کی توجہ اور ہمدردی حاصل کرنا ہو تو حلیہ خراب کر کے پھرنا شروع کر دو۔

ارے جانے کیا بول رہا ہے۔

بھابھی کو تنگ کر رہے ہیں اماں جان سارہ نے اپنی سمجھ دانی کے فائدس میں ماں کو بھی شریک کیا۔

دلہن اپنا خیال رکھا کرو۔ بھلا کس چیز کی کمی ہے تمہارے پاس۔

کپڑے تو میں روزانہ بدلتی ہوں اماں جان۔ وہ پھیکی سی ہنسی ہنس دی۔

اماں جان کا مطلب ہے دلہن بن کر رہا کریں۔

اس عمر میں؟ وہ پھر کھوکھلی ہنسی ہنس دی۔

ہائیں اماں جان تعجب سے بہو کو دیکھنے لگیں۔ کچھ دیر تک تو انہیں الفاظ نہیں سمجھے۔

تمہاری عمر کو کیا ہو گیا۔ تمہاری عمر تو کچھ بھی نہیں تھی۔ جب ہم تمہیں بیاہ کر لاتے تھے۔

ہاں بھابھی بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ بھائی جان کو دیکھے کیا بن ٹھن کر رہتے ہیں۔ سچ جب ہم گھر میں داخل ہو تو آپ پیٹھ موڑ کر کھڑی تھیں۔ اگر آپ کی خوبصورت چوٹی کمر پر نہ لہرا رہی ہوتی تو ہم آپ کو فاطمہ سمجھتے۔ بری بھابھی کو دیکھے۔ ماشاءاللہ اتنے بچے ہیں اور کیا ٹیپ

ٹاپ رہتی ہیں۔

ہم شام کی چا اس وقت پئیں گے جب آپ اچھی طرح تیار ہوں گی۔ چلیں اٹھیں۔

اس نے بیچارگی سے وقار کی طرف دیکھا۔ مگر وہ اپنے بچے میں مگن تھے۔ وہ اٹھی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

حال ایسا نہیں کہ تم سے کہیں

کچھ جھگڑا نہیں کہ تم سے کہیں

وہ غالباً ریڈیو کھلا چھوڑ کر نکلی ہوئی تھی۔ فریدہ خانم نغمہ سرا تھیں۔

کس سے پوچھیں کہ وصل میں کیا ہے

ہجر میں کیا نہیں کہ تم سے کہیں

اس کی آنکھیں بھیگ چلی تھیں۔ اس نے ریڈیو بند کر دیا تھا۔

وہ ہجر کتنا اچھا تھا وقار۔ جب آپ سے آشنا ہو کر آپ کے نام کی انگوٹھی پہن کر گزارا تھا۔ ایک یہ عذاب ناک ہجر ہے جو کاٹے نہیں کٹتا۔۔۔ اس میں آپ کی دید کا دہرا عذاب بھی ہے وقار۔۔۔

اس نے فیروزی کرتا سرخ پانجامے اور دوپٹے کے ہمراہ پہنا۔ ڈھیلی ڈھالی چوٹی بنائی۔ آنکھوں میں صرف کاجل کی باریک سی لکیر ڈالی۔ بس یہ اس نے میک اپ کیا تھا۔ وہ باہر آئی تو دونوں ماں بیٹی نے اسے ستائشی نظروں سے دیکھا۔

اب بھی تو لگ رہا ہے آپ وقار بھائی کی دلہن ہیں۔ سارہ مسکرائی۔

پہلے کس کی لگ رہی تھیں؟ وقار نے تمسخرانہ کہا۔ یہ انداز صرف وہی سمجھ پائی تھی۔

سارہ بھائی کے مذاق پر کھی کھی کر کے ہنس پڑی۔ پہلے بھی آپ ہی کی لگ رہی تھیں۔ بس آج سے ذرا بیس سال بعد والی۔

بھابھی مجھے محسوس ہوتا ہے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا ہے آپ چپ ہوتی جا رہی ہیں۔

اماجان یاد ہے جب ہم نے سادی سے پہلے بھابھی کو بہاولپور میں گلو کی شادی میں دیکھا تھا۔ توبہ کس قدر شرارتیں کی تھیں بھابھی نے۔ کیا نقلیں اتاری تھیں۔ ہنس ہنس کر سب کے

پیٹ میں ب پڑ گئے تھے۔ اور انوکھی خالہ کی نقل پر تو بھابھی کو با قاعدہ انعام بھی ملا تھا۔ جملہ کسنے میں کوئی بھابھی سے آگے نہیں نکل سکتا تھا۔ مین نے تو تب ہی سوچ لیا تھا کہ اس گڑیا سی لڑکی کو وقار بھائی کی دلہن بنائیں گے۔

حالانکہ یہ تمہارے سوچنے کا کام نہیں تھا۔ بلکہ ان کے سوچنے کا کام تھا کہ۔ ۔ ۔ وہ پھر بولے۔

وہ پھر سہ گئی۔ آخر اس نے اپنی ایک حماقت کی سزا بھگتنا ہی تھی۔

پھر وہ رات کے کھانے کی تیاری کے لیے ان کے بیچ سے اٹھ کر آ گئی۔

وہ بے پناہ پرکشش لڑکی تھی۔ اور پھر اب تو سہاگن تھی۔ بار؟؟؟ بڑی دھج اور خوب جھب کے ساتھ ان کے سامنے آئی تھی۔ اور انہوں نے اسے بری طرح نظر انداز کر دیا تھا۔ پھر وہ اس سے۔ ۔ بے نیازی برتنے لگے تو وہ چود سے بے نیازی سے برتنے لگی۔ حالانکہ وہ ابھی جب ان کے سامنے آ بیٹھی تو کشش کی آنچ بے پناہ آئی تھی۔

اس کے کرتے میں لگے سنہری بٹن جگمگا کر انہیں مخاطب کر رہے تھے۔

وہ ان بٹنوں سے کھیلنے کا حق رکھتے تھے۔ وہ تمام حقوق کے مالک تھے۔ بلاشرکت غیرے۔

جب وہ کوئی عام سی بات کرتے کرتے اس کے کان کی بالی ٹھیک کرنے لگتے تو وہ اسے خود سے بے حد قریب اور بے تکلف دوست لگتے۔ ۔ ۔ اس کا جی چاہنے لگتا۔ ۔ ۔ اسے۔ ۔ ۔ ان سے اپنائیت کے یہ انداز گاہے بگاہے ملیں۔

اپنائیت کا چھوٹا سا عمل۔ ۔ ۔ تجدید دوستی کی علامت بنا کرتا ہے۔

لیکن اب انہوں نے اپنائیت کے تمام مظاہرے کسی سربند پٹاری میں سیل کر دیے تھے۔

جب سے اماں جان آئی تھیں ملنے جلنے والوں کا بھرپور سلسلہ قائم ہو گیا تھا۔ ان کی علیحدہ خاطر داری اور وقار کے دوستوں کی چا کافی علیحدہ اس پر مستزاد یہ کہ وقاص کا رونا پیٹنا۔ ۔ ۔ ساس اور نند کی خواہش پر خزد بھی بننا، سنورنا۔

شام کو تمام مہمانوں کی دو پارٹیاں آگے پیچھے آ گئی تھیں۔ سارہ کو تو ویسے بھی کام وام کا زیادہ شوق نہیں تھا۔ پھر بھی اس نے مہربانی کی تھی کافیرنی بنا کر فرج میں رکھ دی تھی اور سلاد بنالیا تھا۔ اور اپنی کزنز کے ساتھ چھت پر جا کر باتوں میں مصروف ہو گئی تھی۔

فاطمہ سات بجے واپس چلی جاتی تھی۔ کافی دور سے آیا کرتی تھی۔ اس کے بھی چھوٹے

چھوٹے بچے تھے۔ اس لیے وہ خود بھی اسے نہیں روکتی تھی۔ وقاص نے رونا پیٹنا مچایا تو وہ اسے گود میں لے کر کام کرنے لگی۔ جب احساس ہوا کہ اب نہیں روگا تو وہ کمرے میں چلی آئی کہ کھلونے دے کر کمرے میں ہی چھوڑ دے گی۔

اس نے بٹھایا تو بیٹھ گیا۔ کھلونے وصول کر لیے لیکن جیسے ہی اس نے جانے کے لیے قدم بڑھایا۔ اس نے پھر شور مچا دیا۔

کیا ہے بیٹا ذرا سی دیر تو امی کو کام کرنے دو۔ ابھی آتی ہوں بیٹا

مگر اسے ماں کے ابھی پر قطعی اعتبار نہیں آیا۔ وہ چیخ پکار مچائی کہ اسے بےپناہ غصہ آ گیا۔ ایک دیا جما کر اس کے پھول سے رخسار پر۔۔۔ ایک کمر پر۔۔۔ تیسرا تھپڑ اگلے رخسار کی سمت چلا تو فضا ہی میں کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پکڑنے والے کا ہاتھ ٹھنڈا اور گیلا تھا۔ اس نے چونک کر دیکھا۔

وقار بڑا سا تولیہ وجود پر پھیلا بکھرے گیلے بالوں کے ساتھ اسے کڑے تیور سے دیکھ رہے تھے، فوراً اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

میں نے تمہیں چھوا نہیں ہے مہ پارا اپنے بچے پر اٹھنے والا اجنبی ہاتھ روکا ہے۔ کسی خوش فہمی میں مت رہنا۔ یہ دو سال کا بچہ ہے کوئی پہلوان نہیں ہے۔ جس پر تم میرا غصہ اتار رہی تھیں۔

آپ غلط سوچتے ہیں۔ رو۔۔۔ رو کر اس نے میرا دماغ خراب کر دیا ہے۔ مجھے کام بھی کرنا ہوتا ہے۔ اس قدر مہمان بھرے رہتے ہیں ہر وقت گھر میں۔

کیا کام ہوتا ہے تمہارے پاس۔۔؟ لان مالی ٹھیک کرتا ہے۔ جھاڑو صفائی صبح انو کر جاتی ہے۔ فاطہ تمہارا ہاتھ بٹاتی ہے۔ کیا سارا گھر نوکروں سے بھر دوں؟

آپ سمجھتے نہیں ہیں۔ بچے کو کچن میں لے کر کھڑا ہونا کوئی معمولی بات نہیں۔ کھانا دونوں ہاتھوں سے تیار ہوتا ہے۔

تو سارہ کو دے دیا ہوتا۔

وہ مہمانوں سے باتیں کر رہی ہے اوپر۔

پھر کیا ہوا۔ کیا وہ منع کر دے گی۔ یہ تمہارے خودساختہ تکلفات ہیں۔ مصنوعی فاصلے۔ محترمہ یہ بات کان کھول کر سن لو۔ تم میرے بچے کو آئندہ اتنی بے دردی سے نہیں مارو گی۔۔ سمجھیں۔

وہ تو بھڑک ہی اٹھی۔ یہ مرد بچے کی خاطر عورت کو کس قدر بیتوقیر کر دیتے ہیں۔ ہوں ان کے بچے۔۔ انہیں بہت درد ہے اور ہمارا کوئی ذکر ہی نہیں۔ موت کے آسمان کو چھو کر آتے ہیں۔ ان کے بچے۔۔۔ ہونہہ۔۔۔ دکھ جھیلیں بی فاختہ اور کوے۔۔۔

ہائیں۔۔۔ لاحول ولاقوۃ۔۔۔ وہ انہیں کوا بنا گئی۔ کاش کوے سرخ وسفید ہوا کرتے تو آج یہ مثل وہ انہیں سنا بغیر نہ ٹلتی۔

اب ایک انسان پریشان ہوگا تو کیا کرے گا۔

بس بچوں کو دھتکارا کرے تمہاری طرح۔ وہ برہم ہو گئے۔

بحث بیکار تھی۔ اگلا کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ باہر آ گئی۔ روتے دھوتے وقاص کو چھوڑ کر کہ ہمدرد باپ بھی ذرا دیر کو مستقل ٹیون میں نغمات سنیں۔

اسی وقت سارہ دھم دھم کرتی سیڑھیاں پھلانگ کر نیچے آئی تھی۔

کھانا لگا دیں بھابھی؟

ہوں۔

سارہ نے غور سے بھاوج کی صورت دیکھی۔

ہم اتنے دنوں بعد ملے ہیں نا بھابھی۔۔۔ اگر ان سے باتیں نہیں کرتی تو وہ برا مان جاتیں۔

وہ بیساختہ مسکرادی دی۔

بیوقوف کیا میں نے تم سے کچھ کہا؟

نہیں تو۔

میں کسی سے مدد وتعاون کا لالچ نہیں کرتی۔ کام جور نہیں ہوں۔ اور پھر تم تو میر کرنے آئی ہو۔ میرا موڈ تو وقاص نے ستیاناس کر دیا تھا۔ بہت روتا ہے بعض دفعہ تو۔

کہاں ہے وہ؟ سارہ نے پوچھا۔

ان کے پاس چھوڑ کر آئی ہوں۔

کہہ تو رہے ہوں گے بھائی جان کہ سارہ نہیں بہلا سکتی۔

ارے نہیں۔ کبھی بھی وہ ایسا نہیں سوچ سکتے۔ سمجھیں۔ اس نے مسکرا کر اس کی سمت دیکھا۔ مگر فکر وتردد کے نشان سارہ کے چہرے پر ہویدا تھے۔

بہت حساس لڑکی تھی۔ باپ کے مرنے کے بعد بھائیوں ہی نے اسے پڑھایا لکھایا۔ اس کی تمام تر ضروریات کا خیال رکھا۔ اس حساس سی لڑکی کو ہر دم یہ خوف رہتا تھا کہ اس کے بھائی، بھابھیاں بدل نہ جائیں۔

اس نے سارہ کو اپنے ساتھ لگا لیا۔

پاگل لڑکی۔۔۔ تم ہماری بہن ہو۔ کوئی ملازمہ تو نہیں۔ جب تمہارا جی چاہے گا۔ ہماری مدد کردگی نہیں دل چاہے گا تو نہیں۔ بابا تم تو ہم سے نخرے اٹھوانے آئی ہو دنیا میں۔

پارو کو اچھی طرح پتا تھا کہ یہ وہ لڑکی نہیں جو محبت پا کر سر چڑھ جا۔ بلکہ وہ محبتوں کی قدر پہچاننے والی لڑکی تھی۔

بھابھی کی اتنی بہت سی محبت پا کر سارہ کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

بھابھی آپ کتنی اچھی ہیں۔ کہیں آپ کو ہماری نظر نہ لگ جا۔

اچھا؟ وہ ہنس دی۔ اس کی ہنسی میں نوحہ تھا۔

بھابھی ہوں۔

یہ دیکھیں میں نے آپ کے لیے کتنا خوبصورت گجرا بنایا ہے۔ موتیے کی کلیوں سے۔

ار۔۔رے۔۔ واقعی بہت پیارا ہے۔ وہ بیساختہ خوش ہوئی مگر دوسرے لمحے بجھ گئی۔

میں گجرے نہیں لگاتی سارہ۔

بھئی یہ کوء مذہبی آرڈر۔۔۔ کوئی قانون یا رسم تھوڑا ہی ہے۔ نہیں لگاتیں تو کیا ہوا آج لگا لیجیے۔ اس نے محبت بھرے انداز میں اس کے بالوں میں ہیئر پن کھینچ کر اس کی مدد سے گجرا اٹکا دیا۔

دیکھیے بھائی جان کتنی پیاری لگ رہی ہیں بھابھی۔

وقار تھوڑے سے فاصلے پر کھڑے شیو بنا رہے تھے۔ برش پانی میں ڈبو کر بہن کی خاطر ذرا سا رخ موڑ کر دیکھا اور بولے۔

واقعی تمہیں گجرا بنانا بہت خوبصورت آتا ہے یعنی گجرا ایکسپرٹ ہو۔

یہ لیجیے۔ میں پوچھ رہی ہوں کہ گجرا بھابھی پر کیسا لگ رہا ہے اور آپ۔۔۔ اس نے بھائی کی کور ذوقی یا تجاہل کو نظریہ ناپسندیدگی پیش کیا۔

بھئی جب گجرا ہی خوبصورت تو ہر جگہ خوبصورت لگے گا۔ خواہ تم اسے لکڑی پر لٹکا کر بیچ صدر میں کھڑی ہو جاؤ۔ اس کی خوبصورتی پر کوئی آنچ نہیں آ گی۔

جایئے آپ کو تو ایڈ مائر) سراہنا(کرنا بھی نہیں آتا۔ وہ برا مان گئی۔

اب کیا تم انہیں بھابھی بنا کر اس لیے لائی تھیں۔ تم گجرے بناتی رہو۔ میں سراہتا رہوں۔ ویسے یہ کام ہے بہت دلچسپ اگر بندے کو غم ہا روزگار نہ ہوں۔ اس کے علاوہ بندے کو بیوقوف بنانے کا اس سے آسان طریقہ شاید ہی کوئی ہو۔

اچھا۔ میں آپ کے خیال میں بھابھی کو بیوقوف بنا رہی ہوں۔ سارہ خفگی سے بولی۔

ہو سکتا ہے؟ وہ مسکرا تو سارہ اظہار خفگی کے طور پر پیر پٹخ کر وہاں سے بائیکاٹ کر گئی۔

انہوں نے آئینے میں اسے گہری نظر سے دیکھا۔ وہ سرخ پھولوں والی قمیص شلوار میں بغیر دوپٹے کے بیٹھی ہوئی غالباً انہیں کی قمیص کے ٹوٹے ہو بٹن ٹانک رہی تھی۔ سفید کلیوں کا گجرا اس کے بائیں شانے پر پڑا جھک آیا تھا۔

اگر تم خود ہی کہہ دیتیں میں بہت حسین لگ رہی ہوں تو بیچاری کا دل رہ جاتا۔ وہ بولے تو اسے بے طرح غصہ آ گیا۔

یہ لیجیے۔ الٹی گنگا پہاڑ پر چڑھنا شاید اسی کو کہتے ہیں۔ یعنی میں خود ہی اپنی تعریف کرنا شروع کر دوں؟

تو پھر تمہارا کیا خیال ہے میں تمہاری تعریفوں کے پل باندھا کروں۔ وہ تمسخرانہ مسکرا۔

نہ میں حسین ہوں نہ اپنے حسن کی داد چاہتی ہوں۔ نہ آپ سے اور نہ کسی اور سے۔ ایک ذرا سی بات آپ نے کیا بنا دی۔ اس نگویا بات ختم کرنا چاہی۔

ارے دلہن پھر کیا سوچا اماں جانے برآمدے میں زور و شور سے داخل ہوئیں۔

ابھی میری ان سے بات نہیں ہوئی۔ اس نے وقار کی سمت دیکھ کر کہا۔

کس سلسلے میں؟ انہوں نے ماں کو دیکھا۔

یہ لو۔ ابھی تک تمہیں معلوم ہی نہیں۔ میں دلہن کو بہاولپور لے کر جا رہی ہوں۔

کس خوشی میں؟ ان کے چہرے کا ہر تاثر ختم تھا۔

ضروری ہے کسی خوشی میں جائیں۔ میں تو جا ہی رہی ہوں، سوچا دلہن کو بھی ساتھ لے چلوں۔ آخر ان کا پورا ننھیال ہے وہاں، مل لے گی۔ جی اور سا ہو جا گا۔

یہی تو میں نہیں چاہتا کہ جی اور سا ہو جا۔ سلگا ہوا لہجہ تھا۔

نہیں بس۔۔۔ یہ نہیں جائیں گی۔ فی الحال نہیں جا سکتیں۔ ایک دم انہوں نے اپنا لہجہ نرم کر لیا۔

ارے بیٹے۔ لڑکی شادی کے بعد دل و دماغ تو نہیں بدلوا آتی کہ اس کو ماں باپ، ننھیال، دھدھیال یاد نہیں رہتے۔ اب یہ بھی کیا۔ کسی کو باندھ کے رکھنا۔ انہوں نے بیٹے کے جبریہ انداز پر افسردگی سے کہا۔

ان سے پوچھ لیں۔ اگر واقعی ان کا دل چاہ رہا ہے۔ انہوں نے واقعی پر زور دے کر کہا۔

نہیں نہیں اماں جان میں نہیں جا رہی۔ میرا دل نہیں چاہ رہا۔۔ پھر وقار کو بھی پریشانی ہوگی۔ کچھ دنوں بعد میں اور وقار آئیں گے۔ وہ گود میں پڑے کپڑے بازوؤں میں سمیٹ کر تیزی سے باہر نکل گئی۔ مبادا بات آگے بڑھ جا۔

وہ کچن میں آ مصروف ہوگئی۔

ایک شیشے کی جار میں منہ دیے جانے کیا نکال رہی تھی۔

میری پریشانی کا بھی خوب کہا۔ کیا نوالے بنا کر کھلاتی ہو مجھے۔ وقار کی مدھم لیکن گھمبیر آواز پر وہ اچھل سی پڑی۔

میری تو پوری زندگی پریشان کر دی ہے تم نے۔

وقار میں نے آپ کو کس قدر یقین دلایا ہے کہ یہ صرف ردعمل تھا۔ اور کچھ نہیں۔ اس نے بمشکل اپنی نم آلود آنکھیں ان سے چرائیں۔

جب ہی میری ماں کو بہاولپور جانے پر اکساتی ہو۔ تاکہ کسی بہانے وہ سرزمین چھو ہی آؤ۔

وقار اس نے بےبسی سے ان کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اشک دیکھ کر وہ نظریں چرا گئے۔

مہ پارہ۔۔۔ بلکہ مہ کامل صاحبہ کسی بھرپور مرد جس کے تمام ظاہری اور باطنی اوصاف مکمل نشونما یافتہ ہوں۔ کی غیرت کی تازیانہ مارنا ایسا ہی ہے جیسے سوناگ کو چھیڑنا۔

تمہیں اعتراف کرلینا چاہیے پاروتا کہ میں تمہیں اپنے قلب کی وسعت کا اندازہ کراؤں اور۔۔۔

خدایا میں اپ کو کس طرح یقین دلاؤں۔

اچھا چھوڑو اس قصے کو۔ ہماری بودو باش کا اہتمام کرو۔ جب ہم چلے جائیں تو مزے سے بہاولپور کے مناظر دیکھ کر خوش ہوتی رہنا خیالوں میں۔

وہ خاموش رہی۔ بعض اوقات ابتدا ہی سے انتہا کا پتا لگ جاتا ہے۔

ظاہر ہے اب تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ بہاولپور چلی جا۔

سارہ نے اور اس کی ساس نے وقار پر بہت دباؤ ڈالا مگر وہ اس پر چھوڑ بیٹھے تھے کہ مرضی ان کی۔

وہ آگاہ تھی کہ یہ مہربانی نہیں ستم رسانی ہے۔

وہ عازمین بہاولپور کو اسٹیشن پہنچا کر آئی تو ضرورت سے زیادہ ہی افسردہ تھی۔ وقار تمام راستے اس پر اچٹتی نظر تو ڈالتے رہے مگر بولے کچھ نہیں۔ بلکہ اس کو گھر کے گیٹ کے سامنے اتار کر گاڑی آگے بڑھا گئے تھے۔ ایسی بھی پرانی بات نہیں تھی بلکہ اسے تو کل ہی کی بات لگتی تھی۔ جب وقار اس کی قربت کی خاطر گھر میں زیادہ وقت گزارا کرتے تھے اور واضح کہا کرتے تھے۔ یار مجھے تو وہ جگہ ہی بے معنی و بیکار نظر آتی ہے۔ جہاں؟؟؟؟

میرے ساتھ نہ ہو۔ اور اب یہ عالم کہ عرصہ گزر گیا ہے دونو کو ساتھ کسی تفریح گاہ گئے ہو کوئی بہترین فلم پکچر ہاؤس میں دیکھے ہو۔

حالانکہ انہیں پتا تھا وہ ویڈیو فلم یا کوئی اور تفریح چیز دیکھنے کی کچھ زیادہ شوقین نہیں ہے۔ اسے تو ویڈیو فلم دیکھنے کا کبھی لطف ہی نہیں آیا۔

تمام دن تن تنہا سارا کام کرنا۔ کبھی چھٹی کے روز وقار کوئی فلم لگا دیتے اور وہ پرشوق نظریں اسکرین پر جما دیتی۔ چند منٹ بعد ہی کال بیل چیخ پڑتی یا فون کی گھنٹی یا پھر اگر یہ نہ ہوتا تو اسے وہم ہوتا وہ کچن کا دروازہ کھلا چھوڑ آئی ہے یا پھر یہ کہ پتا نہیں چولہا دھیما بھی کیا تھا یا نہیں۔ بجائے تفریح کے الٹا اعصابی دباؤ ہاتھ آتا تھا۔

اور رات کو اپنی شر ہو چکی ہوتی کہ تفریح اور بمشکل تفریح نیند لگتی۔ اس لیے اسے پکچر ہاؤس میں فلم دیکھنے کا لطف آتا تھا کہ وہاں واقعی مکمل تفریح میسر آتی تھی۔ شادی کے بعد اس نے وقار کے ساتھ کئی بار لیٹ شو دیکھے تھے۔ باکس میں بیٹھ کر جہاں صرف وہ دونوں ہوتے تھے۔

وہ جوھٹا سا کمرہ اسے جنت لگتا تھا۔ وہ دل کھول کر انجوا کرتی تھی۔ عموماً وہ منتخب انگلش فلم ہی دیکھا کرتے تھے یا پرانی پاکستانی فلمیں۔

اور اب تو سال میں ملنے والی اس ایک آدھ تفریح سے بھی گئی تھی۔ بلکہ وقار تو بھولے سے بھی ذکر نہ کرتے۔ ہر ویک اینڈ پر ایک ویڈیو کیسٹ ہمراہ لے آتے اور ٹھاٹھ سے دیکھتے۔ اور اسے رسا بھی نہ کہتے۔ بعض اوقات وہ اپنے پسندیدہ رائٹر کا رائنگ پلے ہمسایوں کے ہاں دیکھتی۔ ان کو جتانے کی خاطر مگر ان پر مطلق اثر نہ ہوتا۔ اب تو صبر سا آ گیا تھا۔ جل بھن کر کوہ ہونے کے بجا آرام سے نماز پڑھ کر کسی دوسرے کمرمیں سو جاتی کہ کرتے رہیں تنہا تفریح۔ سارہ اور ساس کی غیر موجودگی بہت کھل رہیت تھی۔ وقاص سو چکا تھا۔

آج پھر وہ دیر سے آتے تھے۔ آج پھر وہ ان سے شاکی تھی۔ آچران کیشادی کو مہینے ہی گزرے تھے کوئی سال، قرن تو نہیں۔

سارہ اس کی اندرونی کیفیات بھانپ کر مسلسل چھیڑ رہی تھی کہ وقار نے گھر میں قدم رکھا۔

بھابھی آپ کے لیے اتنی پریشان ہوتی ہیں اور آپ ہیں کہ۔۔۔ اس نے بھاوج کی ترجمانی کی۔

ویسے۔۔ تشریف کہاں سے آ رہی ہے۔ کیسی ہے افشاں؟ اس نے شرارت سے پوچھا۔

بدتمیز۔ وقار نے بہن کے سر پر ہلکی سی چپت ماری اور مسکرا کر آگے بڑھ گء اور اس نوبیاہتا کی فکر بڑھا گئے۔ اسے ایسا لگا گویا اس کا سنگھار اس پر ہنس پڑا ہو۔

اور اس شب اسے وقار کی ہر بات کھوکھلی اور ہر ادا بناوٹی لگی۔

ارواس نے اس نے موقع پا کر سارہ سے پوچھ ہی لیا کہ یہ کمبخت افشاں ہے کون؟

بہت پیاری سی لڑکی ہے بھابھی ہمارے پڑوس میں کرادار آئے تھے وہ لوگ۔ امی کو بہت پسند آئی تھی۔ وقار بھائی کے لیے۔ ہم نے وقار بھائی کو دکھائی تو بس وہ تو افشاں ہی کیہو گئے۔ آدن حیلے بہانے سے افشاں کے ہاں چلے جاتے۔ مگر ہم لوگوں نے دیر کر دی تھی۔ افشاں کا نکاح ان کے رشتہ داروں میں ہو گیا۔ وقار بھائی تو ایک دم بجھ کر رہ گئے تھے۔ وہ تو شکر کریں کہ آپ ہمیں مل گئیں۔ آپ تو افشاں سیہزار درجے اچھی ہیں۔ اللہ کی ہر بات میں بہتری ہوتی ہے۔ بھائی جان بھی بہل گئے ہیں۔ لیکن ایک بات ہے۔ اتنی لڑکیوں میں افشاں ہی بھائی جان کو پسند آئی تھی۔ لے کر چلوں گی کسی دن اپ کو۔ وہ لوگ اب اپنے ذاتی گھر میں شفٹ ہو گئے ہیں۔ اب بھی ہمارا ان کے ہاں آنا جانا ہے۔ افشاں کے بڑے بھائی، بھائی جان کے بہت گہرے دوست بن چکے ہیں۔

وہ اپنی رو میں کہے جا رہی تھی۔ اس کی تاثرات سے قطع نظر۔۔۔

اس کی تو دنیا ہی بدل گئی تھی۔ اسے وقار کے ہر والہانہ انداز پر کوفت ہوتی۔ اسے ایسا محسوس ہوتا گویا اسے بیوقوف بنایا جا رہا ہے۔ وہ بیحد بجھ کر رہ گئی تھی۔ اسے وقار کا اظہار محبت ان کی مجبوری لگتا۔ وہ جب بھی دیر سے گھر آتے وہ بغور ان کا چہرہ ٹٹولتی۔ اگر وہ گنگناتے ہوئے کمرے میں داخل ہوتے تو وہ جل بھن کر سوتی بن جاتی۔ ایسے میں اس کا قطعی جی نہ چاہتا کہ وہ کسی اور کی طرف سے حاصل کردہ خوشی میں اسے شیئر کر کے اپنا مطلب پورا کریں۔

ساس نند کے لاہور جانے کے بعد تو اسے وقار سے اور بھی وحشت محسوس ہوتی۔ اسے وہ اجنبی اور غیر سے دکھائی دیتے۔

کئی دنوں تک جب وہ وقفے وقفے سے دیر سے آ تو وہ ایک دن کہہ ہی بیٹھی۔

نکاح ہی تو ہوا تھا کوئی رخصتی تو نہیں۔ محبت میں تو بہت کچھ جائز ہو جاتا ہے۔

اس کے انگارہ لہجے پر وہ چونک اٹھے۔ مطلب؟

افشاں۔۔۔ میرا مطلب سراسر افشاں سے ہے۔ وہ بھڑک کر بولی۔

او وہ انہوں نے گہرا سانس لیا۔

بہت بیوقوف ہو گڑیا تم۔ ارے بابا۔ کیوں جان جلاتی ہو۔ اب شادی سے پہلے کسی کو معلوم ہے کہ اس کا نصیب کس سے وابستہ ہوگا۔ انسان کی فطرت ہے کہ وہ ہر اچھی چیز کو اپنانا چاہتا ہے۔ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتا ہے۔ محبت تو قدرتی بات ہے۔ یہ پروگرام بنا کر نہیں کی جاتی۔ افشاں۔۔۔ ایک اچھی چیز تھی بس۔۔۔ تم اس سے اچھی ہو۔ یقین کرو۔

یہ تو آپ اس لیے کہہ رہے ہیں کہ اب مجبوری ہے۔ اگر مجھ سے اچھی کوئی نظر۔۔۔

شٹ اپ گڑیا۔ اس قدر تھرڈ کلاس نہیں ہوں۔ سمجھیں۔ وہ برہم ہو گئے۔

یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ شادی سے پہلے کسے معلوم ہوتا ہے کہ مقدر میں کون لکھا ہے۔ میرا ذہن تو آپ کی سمت سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میرا نام کافی عرصے سے ایک کزن کے ساتھ لیا جاتا رہا تھا۔ وہ مجھے بہت پسند کرتا تھ۔ وہ بیڈ پر دراز ہو گئی۔

وقار کے ہاتھ میں ہیئر برش ساکت ہو گیا۔

کون تھا وہ؟ ان کی آواز میں گہرائی تھی۔ صرف وہی پسند کرتا تھا۔۔۔ یا۔ وہ رک گئے۔

میں نے اپنے تاثرات اور خیالات کا کبھی تجزیہ ہی نہیں کیا تھا۔ وہ سادگی سے بولی۔

شادی کے بعد بھی نہیں؟ انہوں نے بغور اسے دیکھا۔

نہیں فرصت ہی نہیں ملی۔ اس نے پھر بڑے سادہ انداز میں کہا۔

اب تو کافی فرصت ہے تمہیں۔ میرا خیال ہے کہ تجزیہ کرلو اور جس نتیجے پر پہنچو۔ مجھے ضرور بتا دینا۔۔۔ اور تمہاری اطلاع کے لیے تا عرض کرتا چلوں۔ مرد بیوی کے انتخاب میں کئی راستوں سے گزرتا ہے مگر ہر راستہ محبت نہیں ہوتا۔

وہ برش پٹخ کر باہر چلے گئے۔ وہ سن ہو کر لیٹی رہ گئی۔ درحقیقت اسے اتنے خوفناک موڑ کا ادراک نہیں تھا۔

اس دن کے بعد وہ اس سے بہت دور ہو گئے۔ اب تو وہ بہت پچھتائی۔ ہزار طریقے سے انہیں سمجھانے کی کوشش کی مگر بیسود۔

قدرت نے اسے بیٹے سے نوازا۔ تب بھی انہوں نے مسرت کا کوئی اظہار نہ کیا۔ بہاولپور جانے پر علیحدہ قدغن لگا دی تھی۔ اس کو اپنی ذات سے اس قدر محروم کر دیا تھا کہ وہ ہمہ وقت اذیت میں مبتلا رہتی تھی۔ افشاں وفشاں سب بھول بھال اسے اپنی پڑ گئی تھی۔

ایک بار اس نے بہاولپور جانے کا ذکر کیا تو وہ اسے گھور کر بولے۔

جی تو چاہتا ہے تمہیں ہمیشہ کے لیے بہاولپور بھیج دوں۔ مگر میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔ وہ کانپ کر رہ گئی تھی۔

اور ایک بار پھر وضاحت پیش کرنا چاہی اور ایک بار پھر وہ ان سنی کر کے باہر نکل گئے تھے۔

آج تمام واقعات یاد کر کے اس کے اشک پھے بہہ نکلنے کو بیتاب تھے۔ درحقیقت وقار اس کے من چاہے مرد تھے۔ اسے ان سے محبت بھی تھی۔ ہر لمحے اسے یہ خیال ستاتا رہتا بلکہ ڈراتا رہتا کہ خدا معلوم وہ کب کوئی فیصلہ کن قدم اٹھالیں۔ بہاولپور جانے کے متعلق وہ ان کو ہمراہ لے جانے کے لیے اصرار کرتی تو وہ ایسا طنزیہ جملہ کہتے کہ اس کی ہمت جواب دے جاتی۔

حالانکہ اس کی شدید خواہش تھی کہ وہ ایک بار اس کے ہمراہ بہاولپور ضرور چلیں۔

امی کے سینکڑوں بلاووں پر وہ آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ اسے بھیجنے پر لیکن سالے صاحب کی شادی کا دعوت نامہ جب سسر صاحب بہاولپور سے لے کر بنفس نفیس خود آ تو وہ شاید بہت مجبور

ہو گئے تھے۔ اور آخر کار کہہ دیا تھا۔

تیاری کر لینا۔ میں تین چار دن کی چھٹی لے لوں گا۔

اور اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اس نے خوشی خوشی تیاری شروع کر دی۔ اس کے چہرے پر خوشی کے عکس اتنے واضح تھے کہ وقار سے پوشیدہ نہ رہ سکے۔ انہیں اس سے سخت نفرت محسوس ہوئی۔

ہوسکتا ہے پارو بیگم واپسی پر میرے ساتھ صرف اور صرف میرا بیٹا ہو۔ انہوں نے انتہا پر جا کر ایک دم سوچا تھا۔

جب وہ ملتان ایئرپورٹ پر اترے تو گرمی کی شدت کا بخوبی اندازہ ہوا۔

ابھی تو شادی میں تین دن ہیں۔ کیوں نہ ہم ایک روز ملتان میں قیام کر لیں۔ نانی خوش ہو جائیں گی۔ وہ بیساختہ کہہ بیٹھی۔

لیکن تم پر جو ایک دن کی تختی بڑھ جاگی۔ وہ اسی طرح دل جلانے والی مسکراہٹ سجا ہو تھے۔ وہ ایک دم چپ ہو گئی۔

اور اپنا تیر نشانے پر لگا دیکھ کر وقار کی خود پسندی میں مزید اضافہ ہوا۔ وہ اور تن گئے۔

بڑے بڑے دالانوں والے گھر میں تمام تر رونقیں اتر چکی تھیں۔ سب اس سے شکوہ کر رہے تھے کہ وہ کیا دور پار کے مہمانوں کی طرح آئی ہے بھائی کی شادی میں۔ محض مسکرا سکی تھی۔ اس کی بچپن کی سہیلیاں اس کی آمد کا سن کر اس سے والہانہ ملنے آئی تھیں مگر اس کی نظریں جسے ڈھونڈ رہی تھیں۔ وہ اسے کہیں نظر نہ آیا تھا۔

وقار سسرالی نوجوانوں کے ہمراہ ادھر ادھر جاتے رہتے تھے۔ رات کو مہمانوں کے لیے دالانوں میں اور چھتوں پر بستر لگتے۔ خوب محفلیں جمتیں، قہقہے برستے۔

اب وہ محض ایک لڑکی نہیں تھی۔ ایک ذمہ دار شادی شدہ عورت اور ایک بچے کی ماں تھی۔ اسے شوہر اور بچے کے ڈھیروں کام ہوتے تھے اس لیے وہ ڈھولک گیتوں اور شرارتوں میں ریک نہیں ہو پاتی تھی۔ اگر کوئی اسے گھسیٹ بھی لیتا تو تھوڑی دیر بعد روتا بلکتا وقاص اس کے بازوؤں میں دے دیا جاتا۔ اور وہ اس میں مگن ہو جاتی۔

سب کو تاسف ہوتا کہ گڑیا تو شادی کے بعد کھو گئی ہے۔ وہ گڑیا جو ان محفلوں کی جان ہوا کرتی تھی۔

درحقیقت اس کے ذہن ان رنگ بھری رفاقتوں میں بھی پریشان ہی رہتا تھا۔ اس نے ماں سے اس کے بارے میں پوچھا تو پتا چلا کہ وہ تو ملتا گیا ہوا ہے۔ آج کل میں آ جا گا۔

اسے وقار کی نظریں اپنی نگرانی کرتی محسوس ہوتیں تو اپنے وجود سے نفرت محسوس ہوتی۔

اور پھر وہ آ گیا۔ گڑیا کو دیکھ کر اس کی خوشی قابل دید معلوم ہوتی تھی۔

وہ سارا دن وقار کو تلاش کرتی رہی۔ ہر دفعہ معلوم ہوتا وہ انتظامات میں ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ اسے عجیب سی الجھن محسوس ہو رہی تھی۔

رات کو پتا چلا کہ وہ اوپر سونے کے لیے جا چکے ہیں۔ وہ اس کے ساتھ اوپر چلی آئی۔

وہ آنکھوں پر بازو دھرے لیٹے تھے۔

سو گئے ہیں وقار؟ اس نے آہستگی سے پوچھا۔

انہوں نے فوراً بازو آنکھوں پر سے ہٹا دیا۔ کیا بات ہے؟ انداز سرد تھا۔

آپ میرے ان فرسٹ کزن سے ملے؟ میرے سگے اور اکلوتے چچا زاد۔۔۔ مسٹر سلیمان۔

وقار ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے بغور سلیمان کو دیکھا۔

پتا نہیں دن میں کتنی بار انہوں نے اس کو آوازیں دے دے کر کام کے لیے بلایا تھا۔

جی جی۔۔۔ اناں نوں ملیا سی میں۔۔۔ سویرے اے میرے نال بازار وی گئے سی۔) جی میں ان سے مل چکا ہوں۔ صبح یہ میرے ساتھ بازار گئے تھے۔(

وقار ہکا بکا اسے دیکھ رہے تھے۔ توصیف) گڑیا کے بڑے بھائی نے اس کے متعلق بتایا تھا کہ وہ ذہنی طور پر بہت پس ماندہ ہے اور اٹھائیس برس کا ہونے کے باوجود بالکل بچوں جیسی حرکتیں کرتا ہے۔ بچپن میں جب وہ چند ماہ کا تھا تو پولیو اور ٹائیفائڈ میں بیک وقت مبتلا ہو گیا تھا۔ نتیجہ آج سامنے تھا۔ دائیں ٹانگ میں لنگ آ گیا تھا اور حرکتیں نچلے طبقے کے بچوں کی طرح تھیں۔ بہتی ہوئی ناک، باچھوں کے اطراف بہتا ہوا جھاگ جسے وہ بار بار آستین سے صاف کر لیا کرتا تھا۔ اس پر ستم یہ کہ ماں باپ بچپن میں ہی داغ مفارقت دے گئے تھے۔ اور گڑیا کے والدین نے اس کی پرورش کی تھی۔ امکان بھر علاج معالجہ بھی کیا۔ لیکن حالت صرف تسلی بخش ہو سکی تھی۔ بالکل ٹھیک نہیں یعنی وہ قطعی طور پر پاگل ہونے سے بچ گیا تھا۔

وہ تو صبح سے ان کے انتظامات میں لگا ہوا تھا۔ اور کچھ نہیں تو چیزیں ہی اٹھانے اور رکھنے

کے کام آرہا تھا۔ وہ ساکت بیٹھے تھے۔

کاکا سو گیا اے بی بی اس نے سڑک بہتی ناک پر کنٹرول حاصل کیا۔

ہاں۔ وہ آہستگی سے بولی۔

مینوں تہاڈا کاکا بہوتا ای سوہنا لگدا اے۔ اے تسی مینوں دے دیو۔) مجھے تمہارا منا بہت اچھا لگتا ہے۔ اسے مجھے دے دو۔ (

ہاں ہاں۔ وہ تمہارا ہی کاکا ہے۔ جاؤ اب تم جا کر آرام کرو۔ وہ شائستگی سے بولی۔ وہ آگے بڑھا تو وہ بھی اس کے ہمراہ ہولی۔ معاً اسے وقار کی آواز سنائی دی۔

گڑیا

وہ رک گئی۔ مہ پارہ کے بعد گڑیا۔۔۔ اسے یقین نہیں آیا۔ وہ پلٹ آئی۔

جی۔

یہ۔۔۔ یہ۔ تمہارا کزن سلیمان ہے؟ وہ اٹک گئے۔

جی۔۔۔ یہ سلیمان ہے جسے سب مانو کہہ کر بلاتے ہیں۔ وہ مسکراہٹ دبا کر بولی۔

انہوں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

دس تاریخ کے چاند کی روشنی میں سہری شلوار سوٹ میں ملبوس ڈھیلی ڈھالی چوٹی اور بڑے بڑے سنہری جھمکوں میں سجی سنری گڑیا جانے انہیں کیا کیا لگی۔

پہلے کیوں نہیں سمجھایا تھا اس بیچارے کا سارا جغرافیہ؟

گڑیا نے آہستگی سے ہاتھ چھڑا لیا کچھ لمحے کھڑی اشک پیتی رہی۔ ناچار چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

وقار اس کے مقابل کھڑے ہو گئے۔

زندگی سے ایسا ہولناک مذاق نہیں کرتے۔ پہلے ہی سب کچھ کیوں نہیں بتایا؟

آپ سنتے تھے؟ وہ آنسوؤں سے بھیگی آواز میں بولی۔

تم نے میرے ساتھ کم زیادتی نہیں کی گڑیا۔ بہت سخت سزا دینے کو دل چاہتا ہے۔ افشاں کے علاوہ نہ جانے گھر والوں نے کتنی لڑکیوں سے متعارف کرایا تھا کہ میں دیکھ بھال کر

کسی کو منتخب کر لوں۔ اب یہ تو نہیں پتہ تھا کہ میری قسمت میں تو اچانک بیوی لکھی ہے بغیر دیکھی بھالی۔

محبتوں کو سمجھ ضرور ہونا چاہیے۔ انہوں نے اس کی پیشانی پر جھومتی لٹیں سمیٹیں۔

پھر سارہ آپ کو افشاں کے نام سے کیوں چھیڑتی تھی۔ وہ اب بھی مشکوک تھی۔

احمق ہے وہ۔۔۔ بابا۔۔ اس کا بھائی میرا بہت قریبی دوست ہے۔ بیشک وہ اچھی لڑکی ہے۔ محض اچھا لگنا عشق نہیں کہلاتا۔ ہر وہ رشتہ گہرہ ہوتا ہے۔ جو باہمی خلوص پر استوار ہوتا ہے اور میرے اور افشاں کے درمیان ایسا کوئی پل نہیں تھا۔

بہت پاگل ہو گڑیا۔ وہ پیار سے اسے دیکھ کر بولے۔ ایک بات اور سن لو۔ بیوی کو قطعی روا نہیں کہ دوسرے مرد کو اپنے شوہر پر ترجیح دے۔ مرد کی عزت نفس کے لیے یہ بہت بڑا تازیانہ ہوتا ہے۔

چاہے وہ خود۔ وہ بسوری۔

جی ہاں۔ چاہے وہ خود زمانے بھر کا دل پھینک ہو۔ وہ شرارت سے مسکرا۔

میں جاؤں۔ لوگ اوپر آ رہے ہیں۔ وہ گھبرا کر بولی۔

جاؤ۔۔ کاش آج ہم اپنے گھر میں ہوتے۔ وہ حسرت سے بولے۔

وہ مسکراتی ہوئی زینے کی سمت بڑھی تھی۔

اختتام---------------------- The End

شکستِ شب

از

رفعت سراج

ناول کا آغاز

اس حسین صدر رنگ میں ایک سادہ سی تمنا بھی تو تھی
جانے آپ سے تصویر بنائی نہ گئی

وہ بہت تیزی سے گیٹ میں داخل ہوئی تھی۔ ادھر ادھر دیکھے بنا وہ تیزی سے بڑھی تھی۔

تابندہ بائیں پہلو سے آواز ابھری اور اس کا دم سوکھ گیا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے گردن موڑی۔

جی؟

ادھر آؤ بھئی آج تصویر بنانے کا سخت موڈ ہے مگر کوئی تصور منظم ہی نہیں رہا۔ سنو۔ ایک دیہاتی لڑکی کی تصویر بنانی ہے جس کے سر پر گھڑا رکھا ہے۔ وہ کسی خاص تصور کے تحت مسکرا بھی رہی ہے۔

مم۔۔۔ مگر۔۔۔ میں۔۔۔ وہ گھڑا۔۔۔

تم بھی دوسروں کی طرح بہانے بنا رہی ہو۔ گھڑا ابھی آ جاگا۔ خدا معلوم میرے وجود سے کون سی ایٹمی شعاعیں نکلتی ہیں۔ جو تم لوگ اس قدر ہچکچاتے ہو۔ اس کے ماتھے پر سینکڑوں بل پڑ گئے۔

وہ۔۔۔ میں تو۔۔۔ شالی کے پاس۔۔۔ کک۔۔۔ کا کام۔۔۔ سے۔۔۔

تو میں کون سا تمہیں عمر بھر کو بٹھا رہا ہوں۔ ڈر کیوں رہی ہو اس قدر؟ کتے نے کاٹا تھا نا مجھے۔ چودہ انجکشن لگوانا بھول گیا تھا۔ کاٹ کھاؤں گا تمہیں؟ وہ ہمیشہ کی طرح جنونی ہو کر اس پر الٹ پڑا اور وہ اس کے بیدام نہ ہوتے ہوئے بھی سہم کر ٹھیک ہی بیٹھ گئی۔

مم۔۔۔ میں منع نہیں کر رہی ہوں۔ لیجیے بنا لیجیے۔

غفور اندر سے گھڑا لے کر آؤ۔ کیسا ہی کیوں نہ ہو۔ جلدی، شاباش۔ اس نے نوکر کو حکم دیا۔ وہ بری طرح ڈر گئی۔ خدا معلوم کب تک گھڑا اٹھانا پڑے گا۔

غفور ہانپتا کانپتا آن واحد میں خدا معلوم کس کونے کھدرے سے گھڑا اٹھا لایا۔

لو اسے سر پر رکھو۔ وہ نزدیک آ کر اس کے سر پر رکھتا ہوا گویا ہوا۔

وہ بے بسی کے عالم میں گھڑا سر پر سیٹ کرنے لگی۔

ہوں، ٹھیک ہے۔ شاباش، مسکراؤ۔ وہ مسکرا دی۔ بڑی بے نیازی مسکراہٹ، ارے بھئی ٹھیک سے مسکراؤ۔ قدرتی مسکراہٹ۔

وہ تھوک نگلتے ہو بڑی بے بسی سے مسکرائی۔

اس نے بڑے غور سے اسے دیکھا اور کینوس پر اسکیچنگ کرنے لگا۔ گھڑا پکڑے پکڑے اس کے بازو شل ہو گئے۔

اوں ہوں، ہلو نہیں۔ وہ جھلایا۔

اس کا دل خون کے آنسو رونے لگا۔ بھلا اس کے اپنے تو اور میں کیوں اس قدر اس کے رعب میں آ جاتی ہوں۔ میں نہیں پکڑتی اب گھڑا وڑا۔ وہ باغی ہونے لگی۔

کیا ہو رہا ہے تمہیں؟ سنتی نہیں ہو۔ ایک مرتبہ کی بات؟ وہ اس کی صورت کا خاکہ بنا چکا تھا، گرج کر بولا تو وہ بری طرح سہم گئی۔

نن۔ نہیں تو، وہ میرے بازو شل ہو رہے ہیں۔ اس نے بلآخر کہہ دیا۔

کیوں کھانا نہیں کھاتیں؟ ٹھیک سے بیٹھی رہو۔

ارے بھئی بازو اس طرح رکھو۔ وہ جھلا کر اس کے نزدیک چلا آیا۔ اے اس طرح سے۔ اس نے اس کے بازوں کا زاویہ درست کیا۔ آنکھیں ٹھیک کرو، اوپر دیکھو۔

اس نے پلکیں اٹھا دیں۔ ساتھ ہی ٹپ ٹپ دو آنسو اس کے رخساروں پر لڑھک آئے۔

ہائیں تم رو رہی ہو۔ کیا تمہیں زدوکوب کیا ہے میں نے؟ مارے کوفت کے اس کا بھیجا الٹ گیا۔ اس کا کہنا تھا کہ آنسو سلسلہ وار بہنے لگے۔

اس نے گھڑا جھپٹ کر گھاس پر دے مارا۔ وہ سہم کر پیچھے ہٹ گئی۔ گھڑے کے ٹھیکروں پر ٹھوکر مارتا ہوا کینوس کی سمت بڑھا شیٹ اکھاڑ کر پرزے پرزے کر دی۔ وہ لرز کر اندر جانے کے بجائے باہر کی سمت بھاگی۔ ٹانگیں بری طرح لرز رہی تھیں۔

اس دن کے بعد اس نے پھر ادھر کا رخ نہیں کیا۔ شالی کئی مرتبہ آئی پوچھا بھی کہ وہ کیوں نہیں آ رہی؟ اس نے گول مول سا جواب دے دیا۔

مگر شالی کے چھوٹے سنی کی سالگرہ میں اس کو جانا ہی پڑا۔ امی نے جانے سے انکار کر دیا کہ بچوں کی محفل میں میرا کیا کام۔ وہ نیلے رنگ کے پلین سوٹ میں بڑی سادگی سے آئی تھی۔

شالی اور اسکی امی انتظامات میں لگی ہوئی تھیں۔ اس نے شالی کا ہاتھ بٹانے کا ارادہ کیا اور کچن میں آ کر چاٹ بنانے لگی۔

چا وا بھی ملے گی یا آج روزہ رکھوایا ہے زبردستی۔ یہ وقت ہو گیا ہے۔ خود سے فرصت ملے تو کسی اور کا دھیان بھی رکھا جا۔

وہ ہمیشہ کی طرح بکتا جھکتا کچن میں آیا تھا۔ مارے گھبراہٹ کے چھری اس کے ہاتھ سے گر گئی۔

اوہ تم ہو، شالی کہاں گئی؟ ایک گھنٹے سے چا کے لیے کہہ رہا ہوں۔ لگتا ہے سب کے کان چوپٹ ہو چکے ہیں تابندہ نے چھری اٹھائی اور اس کی سمت دیکھنے بنا بولی۔

میں بنا دیتی ہوں چا۔

ہاں ذرا جلدی بنا دو۔ ابھی تو سالگرہ میں یہ حال ہے۔ اگلے ماہ وہ شالی سے بڑی کی شادی ہے جو لاہور سیر سپاٹے کرنے گئی ہین۔ اس دوران تو شاید کھانا بھی ہوٹل جا کر کھانا پڑے گا۔ حسب سابق اس کی زبان کی تلوار تیز چل رہی تھی۔

وہ چا بنانے لگی تو وہ فورا گویا ہوا۔

ارے بس، بہت بہت شکریہ، میں خود بنا لوں گا۔ جو ہاتھ دکھ گئے تو ٹسوے بہانے بیٹھ جاؤ گی۔ وہ بیزاری سے کہہ کر الیکٹرک کیٹل اٹھانے لگا۔ وہ اس کے بدلتے انداز پر حیران رہ گئی اور ایک طرف ہو کر ابلے ہوئے آلو کٹنے لگی۔

خدا معلوم یہ چا کی پتی کہاں رکھی ہے؟ سلیقہ نام کی تو کوئی چیز ہی نہیں اس گھر میں۔ وہ عورتوں کے انداز میں صلواتیں سنانے لگا۔ وہ خاموش کھڑی تھی۔

خدا خدا کر کے چا بنی۔ وہ وہیں کھڑا ہو کر پینے لگا۔ اس کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ خدایا یہاں سے جاتا کیوں نہیں؟

ان لوگوں کے ہاتھ کوئی اُدھار لے کر گیا ہے جو خاص طور پر تمہیں امپورٹ کیا ہے۔ اس کا انداز مضحکہ خیز تھا۔

نہیں خیر ایسی تو کوئی بات نہیں۔ یہ گھر بھی تو میرا ہے۔ نزدیکی پڑوسی ہیں، رشتیداروں سے بڑھ کر۔ کوئی غیریت نہیں ہے ہم میں۔ وہ خود پر قابو پا کر آہستگی سے گویا ہوئی۔

خوب۔ وہ مسکرایا مگر انداز وہی کاٹ دار تھا۔ تھوڑی بعد وہ باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد سنی کیک کاٹنے لگا تو شالی نے ماں سے کہا۔

امی احسن بھائی کو بلا لاؤں؟

ارے چھوڑو، وہ ہم بچوں میں آ کر کیا کرے گا۔؟ وہ بیزاری سے بولیں۔

ماں کے کہنے پر وہ چپ ہو رہی مگر کیک کٹنے کے بعد ایک پلیٹ سجا کر اوپر چلی گئی مگر ایک دم اوپر شور سا ہوا۔ شالی کی امی سعدیہ بیگم بدحواس ہو کر زینے کی طرف لپکیں۔ وہ بھی پیچھے ہو لی۔

اور پہنچ کر خوب نظارہ دیکھا۔ پلیٹ کرچی کرچی تھی سارے لوازمات قالین پر بکھرے پڑے تھے۔ شالی دروازے پر کھڑی لرز رہی تھی۔

ارے تم ہوش میں تو ہو؟ کیا کہا ہے تم نے میری بچی کو؟

میں نے کسی کو کچھ نہیں کہا۔ برا مہربانی آپ لوگ یہاں سے تشریف لے جایئے۔

کیوں؟ تمہارے باوا کا استھان ہے۔ ارے ہر وقت میرے صبر کو آزماتا رہتا ہے یہ لرکا۔

جی یہ باوا ہی کا استھان ہے۔ وہ بڑے جذب سے پیٹھ موڑ کر بولا،

ارے خدایا کیا قیامت ہے۔ نامراد گھر میں ذرا سی خوشی نہیں دیکھ سکتا۔ بغضی، حاسد، ایک اس نامراد کو ہر وقت پڑی رہتی ہے۔ احسن بھائی احسن بھائی، ارے یہ بھائی نہیں ہے خون آشام بلا ہے۔ دانت گاڑ دے گا کسی دن حلق میں۔

سعدیہ بیگم نے دو دھپ شالی کے رسید کیے اور روتی ہوئی زینہ اترنے لگیں۔ شالی کو بھی ساتھ گھسیٹ کر لے گئیں۔ وہ باہر ہی کھڑی تھی۔ وہیں کھڑے کھڑے سب کچھ سنا تھا۔ اس نے اس قسم کے مظاہرے متعدد بار اس گھر میں دیکھے تھے۔ بچپن سے لے کر اب تک۔

یہ راز اس پر ابھی منکشف نہیں ہے کہ وہ
مرے بدن کی نہیں روح کی ضرورت ہے

اس دن شالی سے اسے ضروری نوٹس لینے تھے۔ وہ بڑی عجلت میں آئی تھی۔ سارا گھر سنسان پڑا تھا۔ وہ سیدھی شالی کے کمرے کی طرف آئی تھی، مگر وہاں کسی کو نہ پا کر پلٹی ہی تھی کہ

ڈرائینگ روم سے احسن نکلتا دکھائی دیا۔

یہ شالی وغیرہ کدھر ہیں؟ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

وہ میرے نمک خوار نہیں ہیں جو مجھے بتا کر یا اجازت لے کر جائیں۔ حسب عادت تلخ جواب ملا۔

آتی ہوں گی۔ بیٹھ جاؤ۔ اوہ۔۔۔ اچھا آؤ، تمہیں کچھ نئی تصویریں دکھاؤں۔ اس کا موڈ پل میں بدل گیا۔ وہ اسی میں اپنی عافیت سمجھتے ہوا اس کے پیچھے چلی آئی۔

دیکھو، زیادہ تر خواتین ہی کی تصاویر ہیں۔ اس لیے تمہیں پسند آئیں گی۔

یہ دیکھو، یہ انتظار کی کیفیت ہے اور اس میں دیکھو نا امیدی کا تاثر۔ یہ دیکھو، ایفائے عہد کا منظر، بس اس نوجوان کی ذرا مونچھیں ٹھیک کرنا ہیں اور یہ دلہن ہے اس کے سر سے دوپٹہ ڈھلکا ہوا ہے مگر یہ دلہن ہے اور اس کے رخسار پر یہ داغ دیکھ رہی ہو؟ یہ تل ول نہیں ہے۔ سگریٹ سے جھلسا ہوا رخسار ہے یہ۔ تم کہو گی سگریٹ سے کیوں جھلسایا گیا ہے؟ تو عرض ہے کہ عین وقت پر آگ نزدیک تو ہوتی نہیں مگر سلگی ہوئی سگریٹ تو ہر جگہ میسر ہو سکتی ہے۔

تابندہ کی کھوپڑی بھک سے اڑ گئی۔ اس نے بے طرح خوفزدہ ہو کر احسن کی سمت دیکھا۔ گرے شلوار سوٹ میں بظاہر باوقار نظر آنے والا وحشی۔

آپ۔۔۔ آ۔۔ وہ ہکلانے لگی۔

ارے بھئی، ڈرو نہیں۔ یہ تو تصویر ہے۔ مصور کا خیال ہے محض۔

احسن بھائی۔

فرمائیے۔

مجھے جانے دیجیے، آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ وہ مرنے کو ہو گئی تھی۔

ارے بھئی، میں نے کب تمہیں روکا ہے مگر تصویروں پر کچھ کمنٹس تو دیتی جاؤ۔

بہت اچھی ہیں۔ وہ بمشکل بولی۔

یہ جلے ہو رخسار والی، کہو ہے نا منفرد خیال؟

جی۔۔۔ جی۔۔۔ جی؟۔۔۔ جی ہاں۔ اس کا جی تو بہت چاہا کہ اس انفرادیت کی وضاحت مانگے مگر اس وقت جان پر بنی تھی، بری طرح ہکلا کر رہ گئی۔

تابندہ

جی؟ اس نے نظریں اٹھائیں۔ وہ ہاتھ کی اوک میں سگریٹ سلگانے لگا تھا۔ اس نے خوفزدہ انداز میں اسے دیکھا۔ اس نے بھی نظریں اٹھا دی تھیں۔ گھبرا ہو سراپے پر چور نظر ڈال کر وہ بیساختہ مسکرایا۔

ڈرو مت۔ کیوں ڈرتی ہو اس قدر؟ وہ آگے بڑھا۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

کمال ہے یار۔ وہ کمال پر زور دے کر بولا۔ تم تو اس طرح ڈرتی ہو جیسے میں تمہیں سالم نگل جاؤں گا۔ اس نے تصویر پر پردہ گراتے ہو بڑی انسانیت سے کہا۔

تابندہ لڑکیاں اگرچہ شیشہ ہوتی ہیں مگر انہیں جلایا جا سکتا ہے، توڑا نہیں جا سکتا۔ میں

حیوان نہیں ہوں تابندہ اور تم تو شیشے کا حسین بت ہو۔ بہت خوبصورت معبد بنواؤں گا تمہارے لیے۔ مجھ سے کبھی نہ ڈرنا۔

احسن بھائی! وہ سارا ڈر بھول کر بگڑ اٹھی۔ ہوش میں تو ہیں آپ؟

اگر تم سب اسی طرح شک وشبہ میں مبتلا رہے میرے متعلق تو ایک دن واقعی ہوش کھو بیٹھوں گا۔ اگر میں پاگل ہوں، دیوانہ ہوں تو زنجیروں سے باندھ کر مجھے گدو بندر کیوں نہیں چھوڑ آتے۔ حیدرآباد دور ہے یہاں سے؟ وہ دوبارہ اپنے مخصوص رنگ پر آ گیا۔ وہ ایک دم باہر بھاگ لی۔ قدم رکھتی کہیں تھی پڑتے کہیں تھے۔ یوں گمان ہوتا تھا گویا پیچھے سے وہ ایک دم گردن دبوچ لے گا۔

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

شالی سے بڑی منزہ عرف بلو لاہور سے آ چکی تھیں۔ گھر میں شادی کی زبردست تیاراں تھیں۔ بلو کا لاہور جانے کا پروگرام تھا، نہ ارادہ تھا۔ وہ تو نانی زبردستی لے گئی تھیں۔ مگر تابندہ تو اسی دن کے بعد وہاں جا کر نہ پھٹکی تھی۔ یہ بات نہیں تھی کہ احسن کا اس نے یہ رنگ پہلی مرتبہ دیکھا تھا کیونکہ وہ زرعی یونیورسٹی حیدرآباد میں تعلیم پانے کی وجہ سے وہیں ہاسٹل میں تھا۔ اس لیے کچھ فراموش سا کر دیا تھا اسے لیکن اس بار تو اس کی ایک ایک عادت جلا پا کر نکھری ہوئی تھی۔ بچپن اس کے ساتھ گزرا تھا۔ لڑکپن میں اسے برتا تھا مگر جانے کیوں وہ اس سے خوفزدہ رہنے لگی تھی۔ بچپن میں یہ بات بھی تھی کہ چچا چچی کا اس پر سخت کنٹرول تھا مگر اب تو وہ کسی کو گردانتا ہی نہ تھا۔ اس کے یہی ڈھنگ دیکھ کر تابندہ بے حد محتاط ہو گئی تھی۔ کتنے دنوں سے اس کے بلاوے آ رہے تھے مگر وہ نہیں گئی۔ کہ بس بارات والے روز چلی جائے گی۔ کہاں تو یہ شالی کے بغیر نوالہ حلق سے نیچے نہ اترتا تھا، کہاں اتنے اہم موقع پر منظر سے غائب تھی۔ دو دن تو بیماری کا بہانہ چل گیا مگر مہندی کی رسم کے روز تو امی بھی بگڑ گئیں کہ لڑکیاں آ کر روز پاؤں چھو رہی ہیں تم نخروں پر تلی رہی ہو۔ وہ ناچار تیار ہو رہی تھی کہ کسی سے معلوم ہوا کہ احسن بھائی تو پرسوں فیصل آباد کسی کام سے جا چکے ہیں پھر تو گویا اس میں جان بھر گئی۔ نہایت اہتمام سے تیار ہوتی گئی۔ خود پر لعنت بھیجتی گئی کہ اتنی خوبصورت گیدرنگ مس کی۔ کیا ضرورت تھی اس قدر خوفزدہ ہونے کی۔ کون سا اکیلا گھر تھا زمانے بھر کے تو مہمان بھرے ہوئے ہیں۔ شالی کے ہاں، اس نے خود کو نہایت اہتمام سے سنوارا۔ شالی سے کہہ دیا تھا کہ وہ دو دن ان کے ہاں ہی ہوگی۔ آج تو دلہا والے مہندی لے کر آ رہے ہیں، کل ہم لوگ جائیں گے۔ امی کو کیا اعتراض تھا۔ بخوشی اجازت دے دی۔

وہ ایک دم ہلکی پھلکی ہو گئی تھی اور شکر کر رہی تھی کہ وہ یہاں نہیں ہے۔ اس دن کے بعد وہ واقعی اسے بہت ڈر لگنے لگا تھا مگر اب وہ بہت مسرور تھی۔ لڈی، چنک میں حصہ لیا تھا۔ سہاگ کے گیت گائے تھے۔

اگلے روز دلہا کے ہاں جانے کی تیاری میں سارا دن بھگدڑ مچی رہی۔ مہندی کے تھال سجا

گئے، ڈوریاں بنائی گئیں جنہیں لڑکیوں نے تھال اٹھاتے وقت انگلیوں میں لپیٹ کر زنجیر کا سلسلہ بنانا تھا۔

وہ لوگ رات دو بجے واپس ہوئی تھیں، وہاں سے آ کر پھر بجا اس کے کہ کچھ آرام کرتیں ڈھولک لے کر بیٹھ گئیں۔

احسن کی غیر موجودگی میں اس کے کمرے میں بھی مہمانوں کا تصرف تھا۔ وہ سارا دن مصروف رہی تھی، اس لیے نیند لینے کے لیے کمرے میں چلی آئی۔ نیند سے برا حال تھا۔ بیڈ پر ایک دو خواتین دراز تھیں۔ کمرے میں مکمل اندھیرا تھا۔ لان سے قمقموں کی روشنی براستہ دریچے اندر چھن چھن کر آ رہی تھی۔ وہ بیڈ گھرا دیکھ کر صوفے پر لیٹ گئی۔ آنکھیں موندتے ہی غافل ہو گئی۔

مگر اسے اٹھ جانا پڑا کیونکہ کوئی اسے جگا رہا تھا۔ وہ ایک دم بدحواس ہو گئی کیونکہ نیلے بلب کی مدھم روشنی میں اس کے سامنے احسن کھڑا تھا۔

اس نے بیڈ کی سمت دیکھا، کمبل سمٹا ہوا پائنتی پر پڑا تھا۔ چادر پر شکن تھی، تکیے بے ترتیب تھے۔ احسن الگ نیند کا مارا لگ رہا تھا۔ شب خوابی کے آسمانی ڈریس میں وہ خود بھی بے ترتیب سا لگ رہا تھا (یقیناً کسی غلط فہمی کی بنا پر سو رہی ہے)

تابندہ پلیز وہاں جا کر سو جاؤ جہاں دوسری لڑکیاں ہیں۔ میں خود کہیں اور سو جاتا مگر ڈرائنگ روم تک خواتین سے فل ہے۔ اس لیے مجبوراً تمہیں اٹھانا پڑا۔ میں تم بیحد آرام سے سو رہا تھا۔ یونہی آنکھ کھلی تو دیکھا صوفے پر کوئی سو رہا ہے دیکھا تو تم تھیں۔ یہ تمہارے لیے بہتر نہیں ہے تابندہ۔ اس لیے پلیز کسی اور کمرے میں۔ خواہ مخواہ افسانے بن جاتے ہیں۔ وہ بھاری آواز میں بولتا ہوا اپنے ماضی سے بالکل مختلف نظر آ رہا تھا۔

اور وہ تو بہت کچھ سوچ کر ہراساں ہو گئی۔ شرمندہ شرمندہ سی اٹھ کر باہر آ گئی۔ خدایا یہ کہاں سے اگ آئے راتوں رات۔ اس کی تو نیند ہی اڑ گئی تھی۔ یہ وحشی اتنی باریکی سے بھی سوچ سکتا ہے؟ وہ حیران تھی، مگر بہت شرمندہ بھی تھی۔

نگاہ شوق سیر بزم بے حجاب نہ ہو
وہ بیخبر ہی سہی اتنے بیخبر بھی نہیں

رات تو وہ ہوش میں نہیں تھی، نیند و تھکن کا غلبہ تھا مگر صبح اٹھنے کے بعد جب رات کا منظر اس کے ذہن نے دہرایا تو اسے عجیب طرح کی خجالت کا احساس ہوا لیکن یہ بھی ہوا کہ ساری زندگی میں پہلی مرتبہ اس کے لیے تابندہ کے دل میں اچھا سا تاثر پیدا ہوا۔ ساری زندگی اس سے ڈرتی رہی تھی، صرف وہی نہیں، بلو، شالی، سعدیہ بیگم اردگرد کے دوسرے پڑوسی بچے (سابقہ) کہ اب تو وہ سب ان ہی کے ہم عمر تھے۔ پہلے سے زیادہ گہری دوستیاں ہو چکی تھیں مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ احسن کے قریب آنے کے بجائے لوگ اس سے دور ہی ہوتے۔ بہر حال رات اس نے بڑا گہرا تاثر تابندہ پر چھوڑا تھا۔

وہ شالی، سعدیہ بیگم کے ساتھ انتظامات میں مصروف تھی۔ ڈرائنگ روم میں ناشتے کے

بعد پھر ڈھولک پر تھاپ پڑنا شروع ہو گئی تھی۔

تابندہ ایسا کرو، اتنا ابٹن پڑا ہوا ہے، نہانے سے پہلے بلو کے ایک مرتبہ اور لگوا دو۔ ابٹن بہت اچھا ہے۔ مراد آبادی ہے۔ پچھلی مرتبہ رشید) شالی کے والد(کی چچی ہندوستان سے لائی تھیں۔ میں نے بہت سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ شاید بلو اب رضا مند ہو تم اسے ذرا بہلا کر ہی لگا دو، خواہ مخواہ پھنک کر جا گا۔ وہ عجلت میں جلدی جلدی بتا کر نوکر کی طرف مڑ گئیں۔

ابھی ابٹن شروع ہی کیا تھا کہ لڑکیوں نے شرارت شروع کر دی۔ گولے بنا بنا کر نشانے باندھنے لگیں۔ اس کا مہندی کلر کے خوبصورت سوٹ کا ستیاناس ہو گیا۔ وہ اٹھ کر کپڑے بدلنے باہر آ گئی۔

ایک دو سوٹ اس نے ہمراہ رکھ لیے تھے۔ کاسنی رنگ کے پلین سوٹ اور پرنٹڈ دوپٹے میں وہ بھی وہ ایک ہی نظر آ رہی تھی۔ وہ واپس ڈرائینگ روم میں آئی تو لڑکیاں اسی طرح شرارتوں اور گانوں میں مصروف تھیں۔ سوئچ بورڈ کے پاس الیکٹریشن کے ہمراہ احسن کھڑا ہوا تھا۔ تاروں کا گچھا اٹھا ہو غالبا۔ باہر لائٹنگ کا انتظام درست کیا جا رہا تھا۔ آف وائٹ پینٹ اور سیاہ چیک کی شرٹ میں ہمیشہ کی طرح ویل ڈریسڈ نظر آ رہا تھا۔ اس نے دائیں بائیں یوں دیکھا جیسے کچھ ڈھونڈ رہا ہو پھر دانتوں سے تار کاٹنے لگا۔ وہ اس قدر متاثر کن شخصیت رکھتا تھا کہ بہرحال سب اس کی موجودگی ڈرائینگ روم میں محسوس کر رہے تھے۔

شالی کی لاہور سے آئی ہوئی کزن بڑے پیارے پیارے ٹپے، ماہیے گا رہی تھیں۔ وہ ساتھ بیٹھ کر تالیاں بجانے لگی۔ وہ عین اس کے سامنے تھا۔ اب مڑ کو سوئچ بورڈ کھول رہا تھا۔

بعض لڑکیاں جو احسن سے واقف نہیں تھیں اسے دیکھ کر زیادہ ہی چہک رہی تھیں۔

چٹا ککڑ بنیرے تے
کاسنی دوپٹے والیے منڈا عاشق تیرے تے

لڑکیاں ٹپہ گا رہی تھیں۔ (سفید مرغ منڈیر پر۔۔۔ کاسنی دوپٹے والی لڑکا عاشق تجھ پر ہے۔)

لڑکیوں نے شرارت سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ (گاتے گاتے) سب کی نظریں تابندہ پر ٹکیں۔ سچویشن کے عین مطابق وہ کاسنی کپڑوں میں تھی۔ لڑکیوں کے اس طرح ہنسنے پر ایک لمحے کو وہ بھی جھینپ گئی۔ گویا یہ ٹپہ اسی کے لیے تخلیق کیا گیا ہو۔ اسے ایک دم احساس ہوا کہ وہ کسی کی نگاہوں کی زد میں ہے۔ اس نے بیساختہ نظریں اٹھائیں۔ تاروں کے سرے ملا کر بل دیتے ہو وہ مسکراتی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ غالبا اس نے بھی لڑکیوں کی شرارت کا نوٹس لیا تھا۔ تابندہ نے سٹپٹا کر نگاہوں کو جھکا لیا۔ اس کا دل عجیب انداز میں دھڑکنے لگا تھا۔ اس سے تالیاں بھی نہ بجائی گئیں۔ وہ ہنوز سوئچ بورڈ کے پاس تھا۔ ڈھولک کی تھاپ اونچی ہو گئی۔ لڑکیاں کبھی کبھی چور نظروں سے اس خود اعتماد نوجوان کو بھی دیکھ لیتی تھیں جو بہت مصروف تھا۔ شالی دل ہی دل میں حیران ہو رہی تھی کہ آج احسن بھائی گھر میں دلچسپی کیوں لے رہے ہیں۔ ورنہ ان کا تو یہ حال ہے کہ کوئی مرے یا جیے حجان یان کی بلا۔

بارات کی آمد سے قبل وہ بہت اہتمام سے تیار ہو چکی تھی۔ گھر سے امی وغیرہ بھی آ چکی تھی۔ وہ بلو کے پاس بیٹھی شالی کی کلائی میں چوڑیاں ڈال رہی تھی کہ وہ دروازے پر دستک دے کر اندر چلا آیا۔

کیا تم لوگوں نے مہمانوں کے ڈر سے چا کی پتی کہیں چھپا کر رکھ دی ہے ایک تو میں تم لوگوں سے کبھی اپنے کام کے لیے نہیں کہتا ہوں۔ خود کرنے لگتا ہوں تو چیزیں غائب۔ اب کیا چا بھی خرید کر بیڈ روم میں رکھنا پڑے گی۔ وہ بلا کا بے فل اسٹاپ شالی پر برہم ہو رہا تھا۔

بلو نے ناگواری سے منہ بنایا۔ سب اتنے مصروف ہیں، عجیب افراتفری مچی ہے، انہیں بیوقت چا کی سوجھی ہے۔ ابھی چار بجے تو سب چا پی رہے تھے۔

چپ کریں ایسا کہیں سن نہ لیں۔ شالی نے بہن کو ٹہوکا مارا۔

ہونہہ، سن لیں تو سن لیں۔ جان کے دشمن۔ رنگ میں بھنگ ڈالنا تو کوئی ان سے سیکھے۔

بلو کا موڈ خراب ہو گیا تھ۔ تب شالی گھبرا کر اٹھ کھڑی ہی۔

وہیں تھی چا تو، احسن بھائی آپ مجھے کہہ دیتے۔ شالی نے خیر سگالی کا انداز اپنایا۔

تم لوگوں کو اپنے ہار سنگھار سے فرصت تو مل جا۔ اس نے پھر پتھر مارا۔

دیکھا تم نے، اس شالی نے نواب صاحب کا مزاج اور خراب کر دیا ہے۔ خواہ مخواہ آگے پیچھے پھرتی ہے۔

بلو تابندہ کی طرف متوجہ ہو کر گلہ آمیز انداز میں گویا ہوئی تھی۔ اتنا کہتی ہوں، سنی ان سنی کر جایا کرو۔ ان سے تو وہی بات کرے جسے اپنی توہین کرانی ہو۔ اتنا تو کوئی سگا بھی نہ کرتا جتنا ہم نے ان کا کیا ہے۔ میں نے تو امی سے کئی بار کہا کہ انہیں تو بچپن سے ہی پاگل خانے بھیج دینا چاہیے۔ کم از کم سکون تو ہوتا۔ بلو کا لہجہ نفرت سے کڑوا ہو رہا تھا۔

ارے نہیں، اگر پاگل ہوتے خدانخواستہ تو اتنی تعلیم کیسے حاصل کرتے؟ تابندہ سے رہا نہ گیا۔

تم نے سنا نہیں کہ اپنے مطلب کو تو دیوانہ بھی ہوشیار ہوتا ہے۔ بلو نے اپنی نفرت کا جواز پیش کیا۔ بعض اوقات تو صاف لگتا ہے کہ ڈھونگ ہیں، ہمیں زچ کرنے کے۔ تم نے بھی ٹھیک کہا، واقعی تعلیمی ریکارڈ تو ان کا ٹھیک رہا ہے، مگر تم یہ بھی تو دیکھو، کیا یہ انسانوں کے انداز ہیں؟ مجھے تو لگتا ہے کوئی روح حلول کر گئی تھی ان کے اندر۔ بلو کی نفرت لاانتہا تھی۔ وہ تو تھی ہی خاموش طبع کی بلو کی زہریلی باتیں صبر سے سنتی رہی۔ اگرچہ اس کو بہت تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔

تم زمانے کی راہ سے آ
ورنہ سیدھا تھا راستہ دل کا

سعدیہ بیگم شوہر کے انتظار میں ابھی تک جاگ رہی تھیں کہ دروازہ بجا۔

کون ہے؟ آ جاؤ۔ انہوں نے کتاب سے نظریں ہٹا بغیر کہا۔

وہ اندر آ گیا اور بغیر کچھ کہے کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ انہوں نے ناگواری اور تعجب کے ملے

جلے احساسات کے تحت اسے دیکھا تھا کیونکہ وہ کبھی ان کے بیڈروم میں نہیں آیا تھا۔

کیا بات ہے؟ انہوں نے سرد مہری سے پوچھا۔ ایسا رویہ جیسے وہ اپنے بدام سے مخاطب ہوں۔ اٹھ کر بیٹھنے کی زحمت بھی گوارا نہ کی تھی بلکہ مستقل کتاب میں گم تھیں۔

ایک بہت خاص بات کرنی ہے آپ سے۔ اس نے ان کے رویے پر اپنی تلخی چھپا کر بڑے ضبط سے کہا۔

وہ اس طرح اٹھ بیٹھیں جیسے اس کی سات پشتوں پر احسان کیا ہو۔

کہو۔ انہوں نے اس کو بڑی تفصیل سے دیکھا۔

میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے اپنے مخصوص نڈر انداز میں بڑے عام سے لہجے میں کہا۔

کہاں کر رہے ہو؟ انہوں نے رکھائی سے دریافت کیا۔

آپ ہی لوگ کریں گے۔ وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتا ہوا بولا۔

کون دے گا تمہیں لڑکی؟ کم از کم میرے جاننے والے تو یہ سننا بھی گوارا نہیں کریں گے۔ انہوں نے استہزائیہ انداز سے کہا۔

کیوں؟ کیا ہاتھ پاؤں نہیں ہیں میرے یا نابینا ہوں؟ یا غریب اور جاہل ہوں اور نہ ہی بدشکل ہوں۔ حالانکہ سنا ہے مرد کی شکل نہیں دیکھی جاتی۔

یہ ہی تو کہہ رہی ہوں صرف شکل نہیں دیکھی جاتی اور تمہارے پاس سوا شکل کے اور ہے ہی کیا؟ انہوں نے نفرت سے اسے دیکھا۔ سیاہ شلوار قمیص میں اوپر کے دو بٹن کھولے آستینیں پلٹے مکمل مرداں گی کا شاہکار نظر آ رہا تھا۔

اس قدر غلط بیانی سے کام نہ لیں چچی جان اور کیا ہونا چاہیے۔ شکل بھی ہے، پیسہ بھی ہے، باپ کی کمائی بھی ہے۔ میرا مطلب ہے جائیداد وغیرہ۔

سب کا پتا ہے۔ وہ کترا کر گویا ہوئیں۔ مگر پھر بھی کوئی اپنی لڑکی جانتے بوجھتے جہنم میں نہیں جھونکے گا۔

اگر یہ گھر جہنم ہے تو اس میں بھی آپ ہی کا حصہ ہے کہ گھر تو آپ ہی کا ہے۔

میں گھر کی بات نہیں کر رہی ہوں۔ تمہاری حرکتوں، تمہاری عادتوں کی بات کر رہی ہوں، تمہارے پاگل پن کے دورے کی بات کر رہی ہوں۔ ان کی زبان تلوار سے تیز ہونے لگی۔

بس کریں چچی جان حد ہوتی ہے برداشت کی۔ یہ بھی آپ ہی نے اڑائی ہوگی کہ میرا دماغ خراب ہے۔ اس نے جواباً نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

لوگوں کے پاس آنکھیں ہیں۔ اللہ کی دی ہوئی عقل ہے۔

میں مزید کچھ سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ میں تابندہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے بگڑ کر کہا۔

لو بھلا کسی دور پرے رہنے والی لڑکی کا رشتہ مانگتے تو کوئی بات بھی تھی۔ تابندہ ہونہہ دیوار سے دیوار ملی ہے۔ رشتیداروں سے چھپ سکتا ہے کچھ پڑوسی سے نہیں جب کہ ہمارا اتنا میل

جولی بھی ہے۔ وہ بھڑک گئیں۔ خوب ذلیل کرنے کا سوچا ہے بخشو بابا۔ ان کی اکلوتی بیٹی، تعلیم یافتہ، خوبصورت، انہیں رشتوں کی کیا کمی؟۔۔۔۔۔ وہ بھبھک کر بولیں۔ لوگ گھر اور شکل دیکھ کر بیٹیاں نہیں دیتے۔ عادتیں مزاج بھی دیکھے جاتے ہیں۔ تابندہ کا تو خیال بھی ذہن میں نہ لانا۔ ارے میرے آگے بھی بیٹیاں ہیں۔ میں کیوں کسی کی بچی پر ظلم کروں۔ انہوں نے بڑے برہم انداز میں اسے گھور کر کہا۔

محض آپ کی نفرت اور عداوت ہے۔ ورنہ میں خود کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ آپ کیوں مجھے خوش دیکھنے لگیں۔ چچی جان کیا مجھے علم نہیں کہ عرفان بھائی کی شادی چار سال کے لیے کیوں ملتوی کر دی گئی ہے۔ اس لیے کہ لندن جیل سے ان کی رہائی ہی چار سال بعد ہوگی۔ اس نے آگ لگا دینے والی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر گذورا۔

شاید لوگوں کو علم نہیں کہ بلو کی شادی پر آپ بار بار بیہوش کیوں ہو رہی تھیں۔ صدمہ جو دہرا تھا ایک بیٹی کی جدائی کا دوسرے بڑے بیٹے کی غیر موجودگی۔

اچھا تو تم اب اس نیچ پن پر اتر آہو۔

نہیں چچی جان میں تم یہ کہہ رہا ہوں کہ جب ایک سزا یافتہ نوجوان کو ساہوکار کی حسین بیٹی مل سکتی ہے، اصلیت چھپا کر ہی سہی تو پھر میں تو معاشرے میں معزز مقام رکھتا ہوں۔ مفرور نہیں ہوں۔ قاتل نہیں ہوں۔ اس کے باوجود، آپ تابندہ کے ہاں جائیں گی، ہر حال میں وہ میری ہوگی۔۔ وہ میری ہے۔ وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔

دیکھو میاں اگر تم ہمیں اس لیے دبانے کی کوشش کر رہے ہو کہ تمہارے باپ نے رشید کی مالی امداد کی تھی۔ انہیں کاروبار کرایا تھا تو اس احسان کا بدلہ ہم تمہیں اس گھر میں رکھ کر مسلسل ذہنی عذاب میں رہ کر اتار چکے ہیں، جہاں سینگ سمائیں چلے جاؤ۔ خدا کے واسطے اب ہمارا پیچھا چھوڑ دو۔ وہ رونے لگیں۔

میں چلا جاؤں گا چچی جان مگر اس وقت جب تابندہ میری ہوگی۔ میں اسے ساتھ لے کر جاؤں گا۔

وہ لوگ نہیں مانیں گے۔ سعدیہ بیگم نے آنسو پونچھے۔

جب آپ اپنے مجرم بیٹے کے لیے ایک معزز گھرانے کی لڑکی باندھ رکھنے پر قادر ہیں تو؟

جب اصفیہ سے رشتہ ہوا تو عرفان مجرم نہیں تھا۔ وہ بدستور اڑی ہوئی تھیں۔

جب وہ بات چھپ سکتی ہے تو دیکھیے اگر میری شادی تابندہ سے نہ ہوئی تو اصفیہ بھی کبھی اس گھر میں نہیں آ گی۔

تم احمق گستاخ نیم پاگل تو تھے ہی اب بلیک میلر۔ وہ دانستہ رک گئیں۔

خون جو ایک خاندان کا رگوں میں دوڑ رہا ہے۔ بھائی کا اثر تو آ سکتا ہے ناں۔ اسمگلر نہ سہی بلیک میلر ہی سہی اور پھر یہ بلیک میلنگ تو نہیں اپنا فطری حق مانگ رہا ہوں۔ انصاف مانگ رہا ہوں۔ جب تک آپ کا اختیار تھا۔ خوب حق تلفی ہوئی مگر اب چھین لینے کی قدرت رکھتا ہوں۔

تو چھین لو۔ میری منتیں کیوں کر رہے ہو۔

یہ بھی کر سکتا ہوں مگر اس طرح بھی نقصان آپ ہی کا ہے۔ وہ مذاق اڑانے والے انداز میں بولا۔

کاش تمہاری ماں اتنی جلدی نہ مر گئی ہوتی۔ کم از کم تھوڑی بہت تمیز تو سکھا جاتی تھیں۔ وہ بڑبڑائیں۔

آج رات تو فی الحال آپ چچا سے بات کریں۔ باقی باتیں کل ہوں گی۔ وہ پردہ اٹھا کر باہر نکل گیا۔ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگیں۔ ماں باپ کیوں مر گئے اس کے ساتھ یہ بھی مر گیا ہوتا۔ نامراد کون سا سکھ دے رہا ہے سونے کے یا اس کے بغیر دنیا کے کام رکے ہوئے ہیں۔ نیک نامی کی عمارت انہیں لرزتی دکھائی دے رہی تھی۔ اس سے تو کچھ بعید بھی نہیں۔ وہ کوسنوں پر اتر آئی تھیں۔

اسی دم رشید صاحب اندر چلے آئے۔ بیوی کی شکن آلود پیشانی دیکھ کر ٹھٹک گئے۔

بھئی کام ذرا زیادہ تھا، بتایا تو تھا تمہیں۔ وہ سمجھے کہ وہ ان کے دیر سے آنے پر خفا بیٹھی ہیں۔

اجی میری بلا سے ساری رات نہ آئیں آپ۔

اوہو ہو، آج تو واقعی کوئی گڑبڑ ہے۔ انہوں نے کوٹ اتارتے ہوئے تشویش کا اظہار کیا۔

اب بھتیجے کا پالنے سے بہتر تھا آپ مجھ پر سوتن لے آتے۔ ٹھیک نہیں لیا میں نے ساری عمر کا، غضب خدا کا۔ نہ بات کرنے کی تمیز نہ ادب۔ منہ کے آگے خندق ہے، جو منہ میں آتا ہے بک دیتا ہے۔ بس آپ کہہ دیجیے اسے، چلا جائے یہاں سے وہ۔ ورنہ میں کچھ کھا کر سو رہوں گی۔ ان کی آواز بھرا گئی۔

رشید صاحب کو ایک دم وقت کی سنجیدگی و سنگینی کا احساس ہوا۔ وہ بیوی کے پاس کر بیٹھ گئے۔

سعدیہ بھئی آخر بات کیا ہوئی؟

میں برسوں سے کہہ رہی ہوں، یہ لڑکا نیم پاگل ہے۔ اس کا علاج کرائیں، مگر آپ نے میری بات پر کبھی توجہ نہیں دی۔ وہ الٹ پڑیں۔

خدانہ کرے سعدیہ وہ کیوں پاگل ہونے لگا۔ احساس محرومی کی وجہ سے ضدی ہو گیا ہے اور ضد کا علاج محبت ہے۔ تم بھی محبت سے۔۔۔

اجی بس کریں۔ خوب صلہ ملا ہے اسے رکھنے پالنے کا۔ ارے میں نے کون سا اس پر ظلم کیے ہیں۔ اس پر سے ہاتھی گزارے ہیں یا بجلی کے شاک لگائے ہیں۔ وہ شوہر کی بات کاٹ کر مزید تپ کر گویا ہوئیں۔

ہونہہ، احساس محرومی۔ تیس ماؤں کی محبت ایک طرف آپ ایک طرف۔ آپ بھی احساس محرومی۔ آپ کے سامنے بنا رہتا ہے گھنا۔ آنے والے سالوں میں اگر ہم میں سے ایک ایک کو پاگل بنا کر نہ چھوڑ دیا تو نام بدل دیجیے گا میرا۔ کس قدر اذیت و کوفت دینے والی حرکتیں

اور عادتیں ہیں اس کی۔

یہ تو تم بہت عرصے سے کہہ رہی ہوں مگر بتاؤ اب ہوا کیا ہے؟ وہ تھکے ہوئے لہجے میں گویا ہو۔

تب انہوں نے حرف بہ حرف گوش گزار کر دیا۔

غلطی تمہاری ہی ہے سعدیہ تم نے تابندہ کا رشتہ مانگنے سے فوراً انکار کیوں کر دیا۔

جی وہ تو مجھے پتا ہی تھا غلطی میری ہی نکلے گی۔ آپ سے زیادہ جانتے ہیں آپ کے سگے پڑوسی، آپ اس گھر کی چھت تلے چھ گھنٹے گزراتے ہیں۔ ان سے چوبیس گھنٹوں کا ساتھ ہے، خوب واقف ہیں اس کی حرکتوں سے، بدتمیزیوں سے۔۔۔

ایک تو میری سمجھ میں نہیں آتا تم اس کی کون سی بدتمیزیوں اور بیوقوفیوں کا تذکرہ کرتی رہتی ہو۔ ہر وقت تو وہ مصروف رہتا ہے۔

ارے خدا معلوم کس پر گیا ہے آپ کے سامنے تو کمرے سے ہی نہیں نکلتا مکار۔

بہرحال میں خود تابندہ کے والد سے بات کر لوں گا۔

خدا کے واسطے رشید صاحب کیوں اس کی خاطر خود کو خاک کرتے ہیں۔

میں تمہیں تو کوئی تکلیف نہیں دے رہا۔ بس اب تم خاموش ہو جاؤ۔ وہ خود جانتی تھیں کہ وہ بھتیجے کی محبت میں ایک لفظ نہ سنیں گے۔

ارے، وہ کسی کی بچی کی آہ لگ گئی تو۔۔۔؟ رشید صاحب خدا آپ کو سمجھ دے۔ وہ زبردستی سونے کی کوشش کرنے لگیں۔

انہوں نے سوچ لیا۔ وہ اب اس موضوع پر کوئی بات نہیں کریں گی۔ ان پر تو پہلے ہی دکھوں کے پہاڑ ٹوٹے ہوئے تھے۔

زمانہ بر سر آزار تھا، مگر فانی
تڑپ کے ہم نے بھی تڑپا دیا زمانے کو

رشید صاحب کو دیکھ کر تابندہ کے چچا وحید صاحب کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ عید تہوار پر ہی وہ تفصیلی ملا کرتے تھے۔ انہوں نے پرتپاک انداز میں خیر مقدم کیا۔ تابندہ کی امی کو بھی بلا لیا۔ وہ بھی حیران تھیں۔ سر شام انہیں اپنے گھر میں دیکھ کر سعدیہ بیگم زبردستی مسکرانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

دیکھیے بھابی آج ہم نے اپنی غرض کے لیے آپ کے ہاں حاضری دی ہے۔ آپ اور ہم گزشتہ بائیس سال سے ایک ساتھ ہیں۔ ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ رشید صاحب نے رسمی سی گفتگو کے بعد اپنا مدعا بیان کرنے کے لیے میدان ہموار کیا۔

جی، حکم کیجیے اگر ہمارے اختیار میں ہوا تو؟

سب کچھ آپ کے اختیار میں ہے بھابی فی الوقت تو سب ہی کچھ۔

آپ تو اشتیاق بڑھا رہی ہیں بھابی آپ ہی کچھ بتائیے۔ رشید صاحب تو پہیلیوں میں باتیں کر رہے ہیں۔ تابندہ کی امی نے بیتابی سے کہا۔

ہم تابندہ کو اپنی بیٹی بنانا چاہتے ہیں۔ اصولاً سعدیہ بیگم ہی کو لب کشائی کرنا پڑی۔

مگر عرفان کی تو منگنی۔ تابندہ کی امی حیران ہوئیں۔

عرفان کے علاوہ ہمارا ایک اور بیٹا بھی ہے احسن۔ رشید صاحب نے جلدی سے کہا۔

تابندہ کی امی نے چونک کر دونوں میاں بیوی کو باری باری دیکھا، پھر شوہر کو دیکھنے لگیں۔

مگر۔۔۔ آپ تو کہتی تھیں کہ وہ ذہن لحاظ سے۔ وہ حیران تھیں کہ کل تک تو سعدیہ بیگم ان کے پاس اس کے دکھڑے رو کر جاتی تھیں آج اس کے لیئے دست سوال لیے بیٹھی ہیں۔

ارے نہیں وہ دراصل ضدی بہت تھا نا بچپن میں بس جھنجلا کر غصے میں۔۔۔

انہوں نے شوہر کر دیکھ کر زبردستی مسکرا کر بات بنائی مبادا رشید صاحب کا دل مزید برا نہ ہو کہ ان کے لاڈلے بھتیجے کی۔ کتھائیں پڑوسیوں کو بھی سنائی جاتی رہی ہین۔

پھر بھی۔۔۔ اب دیکھیے نا اور بھی لوگوں نے کہہ رکھا ہے اور پھر تابندہ کی رضامندی بھی تو بیحد ضروری ہے نا۔ اب ایک ہی تو بیٹی ہے ہماری۔

ارے بھائی بالکل آپ تابندہ سے ضرور ان کی رضامندی لیجیے مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر آپ نے ہم پر اعتماد کیا۔ تو انشااللہ آپ کا اعتماد اسی طرح قائم رہے گا۔ میں آپ کو جوابدہ ہوں۔ بھائی ہوں آپ کا ہوں ویسے تو بولنا محال ہوتا ہے بھتیجے کے لیے۔ آج کہیں سے ادھار لائے ہیں یہ زبان۔ بس نہیں چلتا ہے لڑکی اٹھا کر لے جائیں اور بھتیجے ک حضور پیش کر دیں۔ سعدیہ بیگم کو شوہر کی یہ عاجزانہ ادا ایک آنکھ نہ بھائی۔

اچھا خیر، ہم سوچ کر جواب دیں گے نا۔ اب شادی بیاہ کا معاملہ ہے، برا نہ مانیے گا۔ آپ رشتہ داروں سے بڑھ کر ہیں ہمارے نزدیک۔ دس پندرہ دن بعد انشااللہ آپ کو جواب دے دیں گے۔ جیسا بھی ہوا، ہمارے اپ کے فیصلے تو کھیل تماشا ہیں، جو بچوں کے نصیب میں ہوگا انہیں وہی ملے گا۔

تابندہ کی امی بیحد سلجھی ہوئی خاتون تھیں۔ بڑی وضع سے انہوں نے اپنی بات ختم کی۔

خدا کرے میرا مان رہ جا۔ رشید صاحب نے سادگی سے کہا پھر سب چائے وغیرہ میں مشغول ہو گئے۔

یہ تو نہیں کہ تم سا جہاں میں کہیں نہیں
اس دل کو کیا کروں، یہ بہلتا کہیں نہیں

بلو آئی ہوئی تھیں۔ اڑتی اڑتی ان تک پہنچ گئی تھی۔ اپنی امی اور شالی کے سامنے استہزائیہ انداز میں ہنس کر بولیں۔

امی وہ نانی جان کسی حیران کن بات پر کہا کرتی تھیں نا کہ سبحان تیری قدرت، سبحان تیرے کی۔ چھچھوندر کے سر میں چنبیلی کا تیل۔

اپنی بات کے اختتام پر انہوں نے ایک بلند قہقہہ لگایا۔ کہاں تابندہ، کہاں احسن بھائی،

ارے امی شکر کیجیے تابندہ کی امی بڑے لحاظ والی ہیں کوئی اور ہوتا تو یہی کہتا کہ یہ منہ، بلکہ احسن بھائی کے حساب سے یوں کہتا وہ منہ اور مسور کی دال۔

اب چھوڑیں اپیا جب انہیں اپنی پسند مل جاگی تو ٹھیک ہو جائیں گے۔ نہیں ہوں گے تو وہ

ٹھیک کر دے گی۔ شالی نے ہمیشہ کی طرح احسن بھائی کی حمایت میں کلمات ادا کیے۔

اُسے اور پاپا کو تو انہوں نے کچھ گھول کر پلا رکھا ہے۔ بدمزاجی کی کوئی حد ہے نہ انتہا۔ بچپن سے پٹ پٹ کرالو بن جاتی تھی ان کے ہاتھوں۔ کوئی غیرت مند ہوتا تو شکل دیکھنا بھی گوارا نہ کورتا۔ بلو نے بہن کو ورغلایا مگر وہ وہاں سے اٹھ ہی گئی۔

اسے اسلام آباد گئے ہو پندرہ روز ہو چکے تھے۔

آج وہ لوگ جواب سننے جا رہے تھے۔ سعدیہ بیگم کو اچھی طرح معلوم تھا کہ کیا جواب ملے گا۔

مگر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب تابندہ کے والد نے اثبات میں جواب دیا۔ دوبارہ تابندہ کی امی نے دہرایا۔ وہ ایسا کرنے پر مجبور تھیں۔ ان کی بیٹی نے تین چار طلب گاروں میں سے احسن کو چنا تھا۔ انہوں نے بیٹی کو سمجھا بجھا کر دوبارہ اس سے پوچھا تو اس نے سر جھکا کر کہہ دیا۔ امی ان سب سے اچھے احسن ہیں۔ وہ خاموش ہو گئیں۔

تابندہ کا وہاں بہت آنا جانا تھا۔ اگر اس نے احسن کی کوئی مشکوک حرکت دیکھی ہوتی تو وہ ایسا کبھی نہ کرتی۔ وہ سمجھدار لڑکی تھی مگر جانے کیوں انہیں دل سے خوشی نہ ہوئی تھی۔ آخر سعیدہ بیگم کا چڑھایا ہوا زہر تھا۔

بہرحال منہ میٹھا کرایا گیا ایک دوسرے کو مبارکباد دی۔ شالی کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔

وہ رات گیارہ بجے کراچی واپس آیا تھا۔ ساڑھے گیارہ بجے تک اسے بذریعہ شالی خوشخبری موصول ہو چکی تھی۔ احسن کو اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا کہ وہ اتنی آسانی سے میدان جیت چکا ہے۔ شالی نے چچا کی کوششوں کے بارے میں بھی بتایا تھا۔ وہ دل سے چچا کا ممنون تھا اور یہ خبر سن کر وہ رات بھر نہ سو سکا تھا۔ ایک خواب سا معلوم ہو رہا تھا۔

تجھے عشق دل سے کام تھا نہ استخواں کا پھونکنا
فقط ایک شہر کے واسطے تو نے نیستاں کو جلا دیا

رخصتی کے بعد جب حجلۂ عروسی میں تابندہ کا میک اپ ٹھیک کرتے ہو شالی نے پوچھا۔

تابی کیا ادا بھائی تھی تمہیں احسن بھائی کی؟ تب وہ نظریں جھکا کر خاموش ہو رہی۔

کیا بتاؤں شالی اسی بیڈ روم کی کہانی ہے۔ آج بھی وہ بھاری آواز کانوں میں گونج رہی ہے۔ تابندہ جاؤ کہیں اور جا کر سو جاؤ۔ خواہ مخواہ افسانے بن جاتے ہین۔ اس نے سر جھکا کر سوچا۔ وہ افسانہ بن کر آج اسی بیڈ روم میں تھی۔ آج اسے کوئی یہاں سے بیدخل نہیں کر سکتا تھا وہ بھی نہیں۔

اس نے رات دو بجے تک اس کا انتظار کیا تھا مگر پھر نیند سے ہار گئی تھی مگر صبح پانچ بجے اس کی خود بخود آنکھ کھل گئی تھی۔ وسیع و عریض بیڈ کے دوسرے سرے پر وہ کروٹ کے بل محو خواب تھا۔ اسے حیا سی آ گئی۔ ملال الگ ہوا کہ وہ کیوں سو گئی تھی وہ کیا سوچتا ہو گا۔

وہ اٹھی بڑی آہستگی سے، بڑی خاموشی سے زیورات اتارنے لگی۔ خوبصورت جوڑا کھولا۔ وارڈ روب سے شلوار قمیص نکالی اور باتھ روم میں چلی گئی۔ بادو پر عروسی جوڑا لٹکا باہر آئی

تو وہ خوابیدہ آنکھوں سے ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔ اسے ٹوٹ کر حیا آئی۔ قدم من من بھر کے ہو گئے۔ صبی انجیز۔ اس کی بھاری خوبصورت آواز کمرے کا سکوت توڑ گئی۔

وہ وہیں جم کر رہ گی۔

تاب ادھر آؤ پلیز۔ اس کا یہ لہجہ قطعی اجنبی تھا۔ وہ جھجکتی ہوئی آگے بڑھ آئی۔

ادھر آؤ، پلیز، میرے پاس۔ وہ نرمی سے گویا ہوا۔

وہ مزید آگ بڑھ آئی۔ احسن نے ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھ سے کپڑے لے لیے۔

سونے کی تہمت رسیا ہو؟ چلو خیر، یہ بھی اچھا ہوا۔ جی بھر کر رات تمہیں دیکھا۔ اتنا پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بہت ساری تصاویر بنائیں ہیں تمہاری۔ اس نے پیچھے کھسک کر اس کے لیے جگہ بنائی اور آرام سے بٹھایا اور اس کی انگلی میں ایک خوبصورت انگوٹھی ڈال دی۔

ایک حقیر سا تحفہ وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر مسکرایا۔

وہ اسی طرح سر جھکا بیٹھی رہی۔ نیند لے لینے سے حسن اور دلکش ہو گیا تھا۔ احسن نے ہاتھ بڑھا کر سگریٹ کیس اٹھایا اور ایک سگریٹ نکال کر منہ میں دبائی، سگریٹ کیس واپس رکھ کر سگریٹ سلگائی۔

خوش تو ہو نا تاب؟ کچھ بولو تو سہی۔ سچی بات تو یہ ہے اگر تمہارے گھر والے انکار کر دیتے تو تمہیں کسی نہ کسی طرح اڑا لے جاتا، کسی قیمت پر تمہیں نہ چھوڑتا۔ خیر اچھا ہی ہوا کہ گھی سیدھی انگلی سے نکل گیا۔

اف۔ تابندہ کے منہ سے بیساختہ کراہ نکلی تھی۔ تڑپ کر رہ گئی تھی وہ۔

اوہ، معاف کرنا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بازو پر سگریٹ کا گول نشان بن گیا تھا، آستین جل گئی تھی۔ اس جگہ سے تکلیف کی شدت سے تابندہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

اف، یہ کیسے ہو گیا۔ ٹھہرو، میں کچھ لگاتا ہوں۔ وہ شرمندہ سا تھا۔ جانے کہاں سے کوئی ٹیوب نکال کر لایا اور بڑی آہستگی سے زخم پر مرہم لگایا۔ تابندہ کی آنکھوں سے آنسو لڑھک کر رخساروں پر آ ٹکے تھے۔

ویری سوری تاب تمہارے جلووں نے اس قدر بیگانہ کر دیا کہ بس۔ آؤ، اچھا لیٹ جاؤ آرام کرو۔ ابھی تو سب ہی سو رہے ہیں۔

وہ جلتے ہوئے بازو کی تکلیف ضبط کرتی ہوئی دوسری طرف آ کر ٹک گئی۔ جلن اس قدر شدید تھی کہ ہر خوبصورت تصور محو ہو چکا تھا اور نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔ اپنی اس انیس سالہ زندگی میں پہلی مرتبہ اس جسم کو جلنے کا احساس ہوا تھا۔ اتنے نازوں سے پالی گئی تھی پھر وہ سلیقہ مند بھی تھی ہر کام میں احتیاط کرتی تھی۔ جلن کی شدت اتنی تھی، چین نہیں پڑ رہا تھا، کسی بھی طرح۔

کیا بہت تکلیف ہو رہی ہے جان؟

اس کے آنسو نکل پڑے۔ اس ٹیوب سے بھی جلن میں کمی نہیں ہوئی۔ وہ بمشکل گویا ہوئی۔

تب وہ اٹھ گیا۔ سامنے دراز میں جانے کیا دیکھتا رہا۔ پھر اس کی طرف پلٹا۔ سائیڈ سے

جگ اٹھا کر گلاس بھرا اور ایک ننھی سی گولی اس کی ہتھیلی پر رکھی۔

یہ گولی کھا لو تاب نیند آ جائے گی۔

اس نے گولی پانی سے نگل لی۔ یہ پوچھے بغیر کہ جلن میں کمی کی گولی ہے یا نیند کی؟

تھوڑی دیر بعد وہ اردگرد کے ماحول سے غافل ہو چکی تھی۔

وہ دوسری جانب کہنیوں کے سہارے اونچا ہو کر اس کا چہرہ بغور دیکھ رہا تھا۔ رخساروں پر آنسوؤں کے نشان ثبت ہو گئے تھے۔

محبت اک تپش ناتمام ہوتی ہے
نہ صبح ہوتی ہے نہ اس کی شام ہوتی ہے

اس نے باہر آ کر شالی سے کہہ دیا۔ گیارہ بجے سے پہلے تابندہ کو نہ اٹھانا اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

شالی پریشان ہو گئی۔ کیا ہوا احسن بھائی؟

ارے بھئی، ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے۔ اب تم ہر جگہ شور نہ مچاتی پھرنا۔

وہ گیارہ بجے جب سو کر نہ اٹھی تو بھگدڑ مچ گئی۔

اسے باقاعدہ ہلا ہلا کر جگایا۔ وہ بمشکل اٹھی مگر بیٹھ کر بھی جھوم رہی تھی۔

کیا ہوا تابندہ؟ احسن کے رشتے کی پھوپھی نے اس کا رخسار تھپتھپایا۔ بیٹی کیا بات ہے؟

اس نے پلکیں اٹھا کر جم غفیر کی طرف دیکھا۔

کچھ نہیں، بس نیند آ رہی ہے ایسے ہی۔ وہ آہستگی سے بولی۔

لو احسن بھائی تو اچھے خاصے کاموں میں لگے ہوئے ہیں۔ تم، یہ تمہارے حصے میں اتنی نیند کہاں سے آ گئی۔ بلو شرارت سے ہنسی۔

ارے وہ مرد ہیں، ان کے اعصاب مضبوط ہیں۔ ان کی کزن ہنسی۔

یہی تو حیرانی کا مقام ہے، ان کے اعصاب تو غیر معمولی طور پر کمزور ہیں۔ ذرا سی بات برداشت نہیں ہوتی۔

تب تابندہ کو احساس ہوا وہ اس طرح جھوم جھوم کر ان لوگوں کو پریشانی میں مبتلا کر رہی ہے۔ تب اس نے خود کو سنبھالا۔

بلو، شالی اس کے ہمراہ ناشتہ کر رہی تھیں۔

بھئی تمہارے شوہر تو آٹھ بجے ناشتا کرنے کے عادی ہیں۔ یہ ہم ہی جاں نثار ہیں جو تمہارے اٹھنے کا انتظار کر رہے تھے۔

ارے شرماؤ نہیں، یہ وہی گھر ہے جہاں تم بے تکلفی سے آتی جاتی رہی ہو۔ ٹھیک سے کھاؤ، لو یہ مونگ کی دال کا حلوہ ہوا می نے خاص طور پر دلہن کے لیے بنایا ہے۔

دل کو تم سے بڑی عقیدت تھی
آج حیران ہو گیا ہے دل

وہ ولیمے کے بعد گھر آئی ہوئی تھی۔ امی نے بتایا۔ احسن کا فون آیا ہوا ہے۔ وہ خوشگوار

دھڑکنوں پر قابو پاتی فون تک آئی۔

ہیلو

جی، میں تابندہ بول رہی ہوں۔

کیا حال ہیں جناب کے؟ ادھر سے شوخی سے پوچھا گیا۔

ٹھیک ہوں۔ اس نے شرمیلی مسکراہٹ سے جواب دیا۔

صرف ٹھیک، اچھا سنو، ایک ضروری بات کرنی ہے تم سے۔

جی۔

سنو، تم اپنی امی کے ہاں ہی رہو۔

جی؟ کیا مطلب؟

پوری بات تو سنو۔ دراصل میں نے اپنا ٹرانسفر اسلام آباد کرا لیا تھا میں یہاں رہنا نہیں چاہتا۔ میں اب یہاں رہ بھی نہیں سکتا۔ کافی سامان آج میں اپنے دوست کے ہمراہ بھجوا رہا ہوں۔ پرسوں ہم لوگ یعنی میں اور تم روانہ ہو جائیں گے۔ تم گھر میں بتا دو۔

لیکن اس طرح اچانک؟ اس نے کچھ پوچھنا چاہا۔

اچانک نہیں ہے زندگی۔ سب کچھ پروگرام کے تحت ہے۔ بس تم وہیں رہنا۔

نہیں آپ برا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں؟ اس نے جھجکتے ہو کہا۔

ضرور۔

کیا گھر والوں سے ناراضگی ۔۔۔؟ وہ بات پوری نہ کر سکی۔

تاب تم میری بیوی ہو، شریک حیات ہو۔ تم سے کچھ چھپ سکتا ہے بھلا۔ ہاں تاب اس گھر سے میری ناراضگی برسوں کی نہیں بلکہ پیدائشی ہے۔ صرف تمہیں حاصل کرنے کے لیے میں نے اپنی طبیعت کے خلاف بہت کچھ سہا ہے۔ میں فلائیٹ سے ایک گھنٹہ پہلے آ کر تمہیں لے جاؤں گا۔ اس نے ریسیور رکھ دیا۔

وہ ریسیور تھامے ساکت کھڑی رہ گئی۔ اس کی شادی روایتی شادی تھی۔ کیا ان اقدام سے لوگ باتیں نہ بنائیں گے اور پھر سب سے بڑھ کر میرے گھر والے کیا سوچیں گے۔ میں آپ کو کیسے کہوں احسن بعض اوقات اپنی ذات کو الگ رکھ کر بھی کچھ کرنا پڑتا ہے،

امی نے اس کی توقع کے عین مطابق ردعمل کا اظہار کیا۔ دماغ تو ٹھیک ہے احسن کا۔ آخر وہ تمہارا سسرال ہے۔ رشتہ مانگنے آ۔ بیاہنے آئے۔ یہ بڑی غلط حرکت ہے۔ تم مل کر جانا اور ان لوگوں نے یہ ٹرانسفر وغیرہ کی بات تو بتائی نہیں تھی۔

امی ٹرانسفر وغیرہ تو ملازمت کے دوران ہوتے ہی رہتے ہیں۔ اس نے بات رکھنا چاہی۔

انہوں نے بیٹی کی صورت دیکھی اور انہوں نے جان لیا۔ احسن کے خلاف کوئی بات کر کے وہ اپنی بات ہی کھوئیں گی۔

مگر جب وہ اسے لینے آیا تو امی نے منا ہی لیا کہ وہ اسے سب سے ملا کر لے جائے۔ خدا معلوم کس طرح راضی ہو گیا۔ وہ بھی چچا کی وجہ سے۔

چچی جان نے بڑی خندہ پیشانی سے دلہن کے سلام کا جواب دیا۔ چچا گھر پر نہیں تھے۔ وہ شالی اور چچی سے مل کر آ گئے۔ محض دس منٹ کے لیے۔ اس کا دل تو بہت برا ہو رہا تھا۔ سب سے جدا ہوتے ہوئے، مگر وہ حقیقت کو تسلیم کر چکی تھی کہ اب تو جہاں وہ رہے گا اسے بھی وہیں رہنا ہوگا۔

اسلام آباد آ کر شدت سے تنہائی کا احساس ہونے لگا۔ وہ تو صبح آٹھ بجے آفس چلا جاتا تھا۔ وہ شروع شروع میں تو بہت مصروف رہی۔

اس روز وہ کچن میں تھی۔ احسن نے چائے کے لیے کہا تھا۔ وہ چائے بنا کر خواب گاہ میں آئی تو وہ بڑی تندہی سے کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ اس کی آمد پر بھی سر نہیں اٹھایا۔ اس نے دروازہ کھولا ابھی تک کسی ملازم کا بندوبست نہیں ہو سکا تھا۔ اسے تمام کام خود ہی کرنا پڑ رہے تھے۔ پتا چلا احسن کے کولیگز آئے ہیں۔ وہ اسے بتانے دوبارہ خواب گاہ میں آئی۔ ایسا معلوم ہوا گویا اسے اس وقت آنے والوں کی مداخلت ناگوار گزری ہو۔ ناچار اٹھ کر باہر چلا گیا۔ اس کا خیال تھا وہ آفس ورک کر رہا تھا وہ کاغذ ترتیب سے رکھنے لگی تو رائٹنگ پیڈ پر نگاہ پڑتے ہی چونک گئی۔ وہ خط میں چچی جان سے مخاطب تھا۔

چچی جان محترمہ

السلام علیکم!

آج ہمیں اسلام آباد آئے ہوئے پورا ایک ہفتہ ہو گیا۔ تابندہ ٹھیک ہے سارا دن کسی نہ کسی کام میں لگی رہتی ہے۔ میں اپنے انتخاب پر خوش ہوں۔ میرا بیحد خیال رکھتی ہے۔ آج کل تو گھر سجانے میں لگی ہوئی ہے، بہت خوبصورت گھر سیٹ کیا ہے، آپ حیران ہوتی ہوں گی۔ میں اس طرح اچانک اسلام آباد کیوں چلا آیا ہوں۔ چچی جان میری طبیعت بہت خوددار ہے۔ اس سے قبل بھی آپ کا رویہ بیحد شان دار رہا، مگر آپ نے کبھی گھر چھوڑنے کے لئے نہیں کہا تھا۔ یاد کیجیے جب میں نے تابندہ کے متعلق آپ سے بات کی تھی، اس وقت آپ نے مجھے خدا کا واسطہ دے کر گھر چھوڑنے کا حکم دیا تھا۔ یقین کیجیے، ہر چیز پر لعنت بھیج کر اسی وقت نکل جانے کو جی چاہا تھا مگر صرف تابندہ کو حاصل کرنے کے لیے اس روز میں نے خود پر جبر کیا تھا۔ اگر اس روز میں گھر چھوڑ دیتا تو شاید تاحیات تابندہ کو حاصل نہ کر پاتا۔ میں نے زندگی میں کبھی کسی چیز کی آرزو نہیں کی تھی۔ ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ ہاں مگر ایک آرزو تابندہ کی تھی۔ میں اپنے رب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ویسے مجھے چچا کی پرخلوص کوشش کے بارے میں شالی نے بتایا تھا۔ انہیں میرا سلام و پیار۔ چچا جان کو کسی روز فون کر لوں گا۔ انہیں بھی سلام دیجیے گا۔

آپ کا نیم پاگل

احسن معید

دوسرا خط کسی دوست کے نام تھا۔ اس نے جلدی سے سب کاغذ تکیے پر رکھ دیے اور باہر آ گئی۔ گویا اس نے صحیح سمجھا تھا۔ احسن نے ہی اس کے لیے کہا تھا۔ پہلے یہ گمان بھی ہوتا تھا کہ شاید رشید چچا نے اپنے طور پر خوشی سے اس کا انگ انگ گنگنا اٹھا، کوئی اس عورت کی خوشی کیا پوچھے جس کا شوہر اس کا جم جم دیوانہ ہو، مگر اسے خط میں ایک بات سخت بری لگی تھی، آپ کا نیم پاگل ہونہہ پاگل ہوں ان کے دشمن۔ وہ سرشاری اپنے کاموں میں مصروف ہو گئی تھی۔

کبھی حیات کی ضامن کبھی وسیلۂ مرگ
نگاہ دوست ترا کوئی اعتبار نہیں

اس روز وہ بے انتہا تھک گئی تھی۔ کچن بند کر کے وہ خواب گاہ میں آ گئی۔ رات کا کھانا وہ آٹھ بجے تک کھا لیتے تھے۔ وہ کمرے میں آئی تو احسن کچھ پڑھ رہا تھا۔

احسن مجھے سخت نیند آ رہی ہے۔ آپ ٹیبل لیمپ جلا لیں میں ٹیوب بند کر رہی ہوں۔

اتنی جلدی ابھی۔

بس بہت تھک گئی ہوں۔ آج تو بہت نیند آ رہی ہے۔ وہ لباس تبدیل کرنے باتھ روم میں جاتی ہوئی گویا ہوئی۔

مگر کل تو جمعہ ہے۔

مجھے تو پتا ہے، مگر نیند کو نہیں معلوم۔ وہ تھکن کی وجہ سے اس کی خوبصورت بات سے حظ نہ اٹھا سکی۔ بڑا سرد سا جواب دیا۔

اور آسمانی فرل لگی نائٹی میں ملبوس بستر پر گر گئی۔

وہ دوبارہ کتاب میں گم ہو چکا تھا۔

گہری نیند میں اسے لگا جیسے اس کے بائیں بازو میں انگارہ اتر گیا ہو۔ اس کی نیند یک دم ٹوٹ گئی۔

اوہ میرے خدا وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔

احسن نے ایک دم کتاب الٹ دی۔ اس کی انگلیوں میں سلگتا ہوا سگریٹ تھا۔

کیا ہوا؟

آپ کو پتا نہیں کیا ہوا؟ وہ جلے ہوئے حصے کو انگلیوں میں دبا کر رو پڑی۔

ارے میں کتاب میں اتنا گم تھا کہ۔۔۔

بس جھوٹ نہ بولیں۔ وہ روتے ہوئے بولی۔

یقین کرو، مجھے پتا۔۔

رہنے دیں، اتنی دور تھی میں آپ سے۔ اس کے آنسو سلسلہ وار بہہ رہے تھے۔

تمہیں یقین نہیں آ گا، وہ ٹیوب کہاں ہے؟

میں خود لگا لوں گی۔ وہ خفگی سے بولی اور اٹھ کر لائٹ جلا کر ٹیوب نکالنے لگی۔ ٹیوب لگا کر آنسو پونچھے۔ وہ اٹھ کر اس کے نزدیک چلا آیا۔

کوئی معذرت بھی نہیں سنو گی؟

اس نے آنکھیں رگڑ کر بے خفگی سے اسے دیکھا۔ سفید شلوار قمیص میں ملبوس اس کا مضبوط سراپا بیحد شان دار نظر آ رہا تھا۔ گھنی مونچھوں تلے اس کے لب معذرتی انداز میں مسکرا رہے تھے، مگر وہ منہ موڑ کر بیڈ پر چلی آئی اور چادر تان کر لیٹ گئی۔ جلن کی شدت کی وجہ سے نیند اڑ گئی تھی۔ خواہ مخواہ رونا آ رہا تھا۔

ٹیوب بند کرنے کے لیے احسن نے بٹن دبایا۔ اس نے آواز سنی۔ اس کے بعد وہ بیڈ پر واپس آیا۔ لیمپ بند کیا اور شاید فوراً ہی سو گیا تھا۔

کچھ اس ادا سے یار نے پوچھا مرا مزاج
کہنا پڑا کہ شکر ہے پروردگا کا

وہ اس سے پورے دو دن خفا رہی۔ اس کے منانے کی ہر کوشش ناکام ہو گئی مگر تیسرے دن احسن کو فلو ہو گیا۔ تب اسے دوستی کرنی پڑی اور کون تھا گھر میں جو اس کی دیکھ بھال کرتا۔

تاب اتنی شدت سے خفا نہ ہوا کرو۔ وہ اس کے لیے کافی لائی تو وہ بہت یاسیت سے گویا ہوا۔

آپ نے میرا بازو دو مرتبہ جلایا ہے۔ پتا ہے کتنی جلن ہوتی ہے۔ وہ شاکی لہجے میں گویا ہوئی تھی۔

تب اس نے اس کی آستین اوپر کی دودھیا بازو پر ننھا سا سرخ نشان تھا۔

کیا واقعی تم سمجھ رہی ہو کہ میں نے جان بوجھ کر تمہارا بازو جلایا ہے؟

تو اور کیا۔

یقین کرو بیخبری میں۔

یہ خوب بیخبری ہے۔ کسی کی جان پر بن جائے بلا سے۔ اس نے ناز سے کہا، اس دن بھی جلا دیا تھا۔ وہ مزید گویا ہوئی۔

کس دن؟ اس نے مسکرا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

مجھے نہیں پتا۔ وہ شرما گئی اور بہانے سے کمرے سے نکل گئی۔

کچھ خیال نہیں رہتا کچھ دھیان نہیں رہتا
انسان محبت میں انسان نہیں رہتا

تابندہ کئی روز سے دیکھ رہی تھی۔ جب وہ ایکسرسائز کرنے لان میں جاتی تو ایک خاتون پڑوس کے لان میں کھڑی ہو کر پرشوق نگاہوں سے دیکھا کرتیں۔ اسے وہ بہت اچھی لگیں۔ اس دن وہ ایکسرسائز کا پروگرام ملتوی کر کے باڑ کے پاس جا کھڑی ہوئی اور خوبصورت انداز میں سلام کیا۔

وعلیکم السلام۔ آپ نئے لوگ آئے ہیں غالباً۔ ارے یہیں کھڑے ہو کر آپ سے باتیں کرنے لگی۔ آئیے اندر آئیے نا۔ تب وہ ان کے پیچھے ہو لی۔

خاتون خانہ اسے ڈرائنگ روم میں لے آئیں۔

آئیے تشریف رکھیے۔ میں اپنے میاں سے کہہ رہی تھی کہ ہمارے پڑوس میں ایک بہت

کیوٹ سی لڑکی آئی ہے۔ خاتون نے پراشتیاق نظریں اس پر دوڑائیں۔

وہ شرما سی گئی۔

کہاں سے آئے ہیں آپ لوگ؟

کراچی سے۔ اس نے آہستگی سے کہا۔

کون کون ہے آپ کی فیملی میں۔ میرا مطلب ہے بہن بھائی، والدین یعنی ہمارے پڑوس میں رہنے والوں کی تعداد۔ وہ ہنسیں۔

جی، فی الوقت تو صرف میں اور میرے میاں ہیں یہاں۔ اس نے بتایا۔

ارے ماشااللہ شادی شدہ ہو، بالکل نہیں لگتیں۔ کب ہوئی شادی؟

گزشتہ ماہ کی تین تاریخ کو۔

ارے بالکل نئی دلہن ہو۔ کیا سسرال والوں نے آتے ہی نکال دیا تھا؟

نہیں، بس میرے میاں کا یہاں ٹرانسفر ہو گیا۔

ارے بھئی، بالکل نئی دلہن ہو۔ کچھ سج بن کر رہا کرو۔ اتنی سادہ تو غیر شادی شدہ لڑکیاں بھی نہیں رہتیں۔ تمہارے میاں بھی نہیں کہتے۔ خیر انہیں آج کل ہوش کہاں ہوگا۔ خاتون بےتکلف تھیں۔ اسے اچھی لگیں۔

لو بھلا ہمارا یہ حال ہو گیا تمہیں دیکھ کر نہ تمہارا نام پوچھا نہ تمہارے میاں کا نہ اپنا بتایا نہ اپنے میاں کا نہ بچوں کا۔

جی میرا نام تابندہ ہے۔ میرے شوہر کا نام احسن معید۔

اور بھئی تابندہ مجھے نادرہ کہتے ہیں۔ میرے شوہر ڈاکٹر معین صدیقی سائیکالوجسٹ ہیں۔ تین بچے ہیں میرے۔ ایک بیٹی روبینہ، دو بیٹے عاطف اور واصف۔ دیکھو بھئی اب ہماری دوستی پکی ہے۔ بلا جھجک بتاؤ۔ چا، کافی کا کولڈ ڈرنک۔

انہوں نے جھٹ بات کا پہلو بدل دیا۔

جو آپ کی مرضی۔ اسے کہنا پڑا۔

وہ جو گرے کرولا میں روزانہ آٹھ بجے نکلتے ہیں اگر وہی تمہارے شوہر ہیں تو بلاشبہ مور اور مورنی کی جوڑی ہے، چشم بد دور۔ وہ پہلی ملاقات ہی میں اتنی بےتکلف اور محبت سے بول رہی تھیں کہ تابندہ متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکی اور اس کی طرف سے خوبصورت تاثر لیے ہوئے چلی آئی بلکہ بہت مسرور تھی کہ وقت تو خوشگوار گزرے گا، ان کی رفاقت میں۔

شام کو احسن آیا تو سب سے پہلی خبر اس نے یہی سنائی۔

اگر تمہارے لیے یہ بات خوشی کی ہے تو بھلا اس سے بڑھ کر میرے لیے کیا خوشی ہو سکتی ہے۔ اس نے تابندہ کے خوبصورت چہرے پر والہانہ نظر ڈال کر خوش دلی سے کہا۔

اچھا سنیں، آج ہمیں کہیں لے کر چلیں۔ وہ ناز سے بولی۔

کہاں؟ وہ جاتے جاتے پلٹ آیا۔

کہیں بھی، اب میں یہاں کی جگہوں سے تو واقف نہیں ہوں نا۔ بس دل چاہ رہا ہے کہیں

گھومنے پھرنے کا۔

اپنی پڑوسن کے ہمراہ چلی جانا نا۔ اس نے چھیڑا۔

جی نہیں، اگر مجھے جانا ہوتا کسی کے بھی ساتھ تو اتنے دن ہو گئے ہیں یہاں آ ہو، میں آپ کے ساتھ گھومنا چاہتی تھی یہاں۔ اس نے خفگی سے کہا۔ آپ کے ساتھ۔

طیا گل کرو گی بھئی مجھے، اتنی محبت نہ جتای کرو۔ وہ اس کے نزدیک آ کر بڑے وارفتہ انداز میں بولا۔ بھئی مجھے خود احساس ہے، فکر نہ کرو۔ خوب گھماؤں گا۔ احسن نے اس کا ہتھ تھپتھپایا۔

اس نے بھی اس کی مجبوری جان کر ضد نہ کی۔

اور ہاں تابندہ وہ جو اوپر کمرہ ہے نا، میری تمام پینٹنگ وہاں سیٹ کر دینا۔ ایزل وغیرہ بھی تمام کلرز، برش وغیرہ۔ آئی ول بی تھینک فل ٹو یو مائی سوئٹی۔ کبھی کبھار اچانک آمد ہوتی ہے۔ میں نے ایک دو افراد سے ملازم یا ملازمہ کے لیے کہہ رکھا ہے۔ تم بھی اپنی نئی پڑوسن سے کہہ دینا۔ ہو سکتا ہے ان کے ذریعے ہی کام بن جا۔ تمہیں بھی آرام مل جا گا۔

وہ جلدی سے کھانا کھا کر دوبارہ چلا گیا۔ وہ پھر بور ہونے لگی۔ وقت گزارنے کے لیے بڑے سے صندوق سے اس کی پینٹنگز نکال کر صاف کرنے لگی۔ بڑی خوبصورت تصاویر تھیں جو اس نے پہلے بھی دیکھی ہوئی تھیں۔ اس دلہن کی تصویر بھی تھی جس کے بارے میں احسن نے انکشاف کیا تھا کہ اس کا بایاں رخسار سگریٹ سے جھلسا ہوا ہے۔ تصویر پر نظر پڑتے ہی اس دن کے تمام واقعات اس کی نظروں کے سامنے گردش کرنے لگے۔ اسے ایک دم سے خوف محسوس ہونے لگا۔ دل میں محبت کا ہر تاثر ختم ہو کر خوف و ڈر قدم جمانے لگا۔ بازو پر لگے ہو سگریٹ کے داغ از سر نو دہکنے لگے۔ اسے ایسا محسوس ہوا گویا اس کا جسم سگریٹ سے داغ دیا گیا ہو۔ وجود کا ہر حصہ اسے گھر کے در و دیوار سے خوف محسوس ہونے لگا۔ وہ باہر گیٹ کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ ایک دم کراچی شدت سے یاد آنے لگا۔ ایک ایک کر کے تمام لوگ ان کے ساتھ، ان کے ساتھ گزارے ہو لمحے، ماہ و سال۔ خواہ مخواہ ہی آنسو بہنے لگے۔ وہ جانے کب تک اسی طرح بیٹھی رہی تھی۔ کار کی ہیڈ لائیٹس اس کے چہرے پر پڑیں۔ احسن نے کار وہیں روک لی اور حیران و پریشان سا گاڑی سے اتر آیا تھا۔

تاب جان یہاں کیوں بیٹھ گئیں آ کر؟ وہ پاس آ کر اسے شانوں سے تھام کر اٹھاتے ہو حیرانی سے بولا۔ وہ بے آواز رو پڑی۔ وہ بے طرح پریشان ہوا تھا۔

کیوں؟ کیا ہوا ہے؟ خدارا بتاؤ نا۔ وہ اسے اندر لے آیا۔

وہ بری طرح سسک پڑی۔

احسن آج آپ ایک وعدہ کریں۔ ورنہ میں اندر نہیں جاؤں گی، یہیں کھڑی رہوں گی۔ وہ بسوری۔

آپ آج سے کبھی سگریٹ نہیں پئیں گے۔ وہ برابر رو رہی تھی۔

کیوں کیا محکمہ صحت والے آ تھے۔ اس نے مذاق کیا۔

مذاق نہیں کریں، وعدہ کریں۔ وہ خفگی سے گویا ہوئی۔

دیکھو پچھلے ماہ کی تین تاریخ سے اب تک تم سے اتنے عہد و پیمان کر چکا ہوں کہ کسی جمہوری صدر نے سالوں میں نہیں کیے ہوں گے۔ ابھی بھی وعدہ؟

احسن میں سیریس ہوں، ورنہ مجھے کراچی بھیج دیں۔ مجھے آپ سے، میرا مطلب ہے آپ کی سگریٹ سے ڈر لگنے لگا ہے۔

تابی وہ اسے اندر لے جاتے ہوئے گویا ہوا۔ تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ بابا میں نے دانستہ تمہارا بازو نہیں جلایا۔ خدارا معاف کر دو یار۔ اب دیکھو نا سگریٹ ایک دم تو نہیں چھوڑی جا سکتی، البتہ کم ضرور کی جا سکتی ہے۔ چلو یہ وعدہ کہ گھر میں زیادہ نہیں پیوں گا، اتنی رعایت تو دو گی نا۔

پرسش غم رہنے دیجئے
یہ تماشا ہے میرا دیکھا ہوا

آج ان پر ایک اور حیرت کا پہاڑ ٹوٹا تھا۔ وہ کچن میں جلے ہوئے کاغذ دیکھا کرتی تھی۔

اس کا خیال تھا احسن سگریٹ جلانے کے لیے کاغذ وغیرہ جلا لیتے ہیں لیکن آج چھٹی کے روز وہ تولیے سے ہاتھ پونچھتی تیزی سے کچن میں آئی تھی اور ٹھٹک کر رہ گئی تھی۔

احسن کاغذ کی پٹی بنائے جلا کر بہت غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ یہاں تک کہ پورا کاغذ جل گیا۔ اس نے دوسرا ٹکڑا اٹھا کر موڑا اور آگ کے نزدیک لے گیا پھر جلتے ہوئے کاغذ کا بغور دیکھنے لگا۔ یہ ٹکڑا بھی بھڑ بھڑ جل کر ختم ہو گیا۔ وہ تیزی سے احسن کے سامنے آ گئی۔

یہ آپ کاغذ کیوں جلا رہے ہیں؟ اس نے تعجب سے احسن کو دیکھا۔

احسن نے نظریں اٹھا کر تابندہ کو دیکھا۔ تابندہ کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد سی لہر دوڑ گئی۔ جانے کیا تھا اس کی آنکھوں میں۔

کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ وہ خوف زدہ انداز میں بولی۔

وہ جیسے ایک دم ہوش میں آ گیا، ہنس کر بولا۔ ارے ایسے ہی فالتو ٹکڑا تھا، بس یونہی غیر ارادی سی حرکت تھی۔

مگر تابندہ کے ذہن میں ایک گرہ سی پڑ گئی۔ اسی دن دوپہر کو جب وہ آلو چھیل رہی تھی احسن پاس آ کر بیٹھ گیا۔ وہ آلو چھیل کر مٹر چھیلنے لگی۔ احسن نے ایک آلو اٹھایا اور چاقو سے گودنا شروع کر دیا۔ آلو کا کچومر نکال دیا۔

اللہ، یہ آپ نے کیا کیا؟ اس نے شاکی انداز میں کہہ کر چاقو اس کے ہاتھ سے لے لیا اس سے پیشتر کہ وہ مزید غور و خوض کرتی، نادرہ بھابھی اپنے شوہر کے ہمراہ آ گئیں۔ گھر میں رونق سی ہو گئی۔

نادرہ کے شوہر بھی بہت دلچسپ انسان تھے۔ احسن بھی ان سے مل کر بہت خوش ہوا۔ وہ رات کے کھانے پر دونوں کو بلانے آئے تھے۔ انہوں نے بہت انکار کیا مگر ان کے سامنے ایک نہ چلی۔ ناچار انہوں نے دعوت قبول کر لی۔

دعوت بہت خوشگوار رہی۔ اس کا ذہن بھی ہلکا پھلکا ہو گیا۔ بہت خوش خوش نظر آ رہی تھی۔

نادرہ کے بچے بھی بہت شرارتی تھے۔ ان کی باتوں میں وقت کا پتا ہی نہ چلا۔ تقریباً رات کے ایک بجے وہ گھر واپس آئے تھے۔

زندگی بڑی تیزی سے گزرنے لگی تھی۔ اسے یہاں آئے تیسرا مہینہ تھا۔ اس کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ نادرہ بھابھی اس کا دل بہلایا کرتیں۔ دونوں گھروں میں بے حد بے تکلفی ہو گئی تھی۔ اس نے احسن کو کبھی دوستوں میں خوش گپیاں لگاتے نہیں دیکھا تھا مگر معین بھائی کی شفقت کے سامنے وہ بھی بے بس تھا۔

ان تین مہینوں میں اس نے احسن کے ہزاروں رنگ دیکھے تھے۔ محبت کے رنگ، سرد مہری کے رنگ، خفگی کے رنگ، خوشی کے رنگ، دکھوں کے رنگ۔ اس نے پل پل تابندہ کو حیران کیا تھا لیکن اس کی چاہت کا رنگ ہر رنگ پر حاوی تھا۔ اس لیے اس نے بھی بڑے پیار سے سمجھوتے کر لیے تھے۔

اس نے اس کے جنون کے رنگ شادی سے پہلے بھی دیکھے تھے مگر اس کی اس بات نے اس کے دل کو شکست دے دی تھی۔ اتنے لوگوں کے ہوتے ہوئے صرف وہی اس کے خیالوں میں آ بسا تھا۔ شادی کے بعد معلوم ہوا کہ اسے محبت کرنا آتی ہے اور تابندہ کے لیے یہ بہت بڑی بات تھی کہ وہ اس کائنات کی محبت پرست عورت تھی۔ ایک روز اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھ بھی لیا تھا۔

احسن چچی جان، بلو شالی کے ساتھ آپ کے انداز کچھ اور ہوتے تھے بلکہ ہر ملنے والے سے۔ بہت تنہائی پسند تھے لیکن یہاں تو آپ بہت بدلے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ آپ تو بہت محبت کرنے والے ہیں۔

ارے کہاں محبت کرنے والا ہوں۔ قرض چکاتا ہوں تمہاری محبت کے۔ اس نے گویا انکساری برتی۔

اور وہ بڑے ناز سے مسکرا دی۔

☆

غم موجود ہے آنسو بھی ہیں کھا تو رہا ہوں پی تو رہا ہوں
جینا اور کسے کہتے ہیں اچھا خاصا جی تو رہا ہوں

اس کی طبیعت بہت گری گری رہنے لگی تھی۔ وہ خاموشی سے لیٹی ہوئی تھی۔

تاب دیکھو میں اوپر ہوں۔ کام کر رہا ہوں۔ کوئی آئے تو مجھے ڈسٹرب نہ کرنا اور ایک

کپ اچھی سی کافی بنا لانا۔

اچھا۔ اس نے کاہلی سے جواب دیا۔ وہ اسی طرح پہلو کے بل لیٹی رہی، پھر ایک کتاب نکال کر پڑھنے لگی۔ کتاب پڑھتے پڑھتے اسے کافی دیر ہو گئی تو وہ کافی بنانے کے لیے اٹھ گئی اور دوپٹہ اوڑھتے ہوئے کچن میں چلی آئی۔ کافی بنائی، بڑے پیار سے سجائی اور مسکراتی ہوئی اوپر آ گئی۔ انگوٹھی سے دروازہ بجایا، نچلا ہونٹ دبا کر آہستہ سے کہا۔

احسن

ہوں، آجاؤ۔ اس کی مصروف سی آواز آئی۔

وہ اندر چلی آئی۔ وہ بڑی تیزی سے کینوس پر برش چلا رہا تھا۔ بے حد خوبصورت پینٹنگ تھی۔

احسن آپ کی پینٹنگز مکمل ہو جائیں تو دیکھیے گا ایگزیبیشن کا اہتمام ضرور کرواؤں گی، کراچی میں۔

ارے نہیں بھئی، یہ تو یونہی فضول سا شوق ہے۔ بس دل کا غبار نکالنے کا بہانہ۔ اس کے ہونٹوں میں سگریٹ دبا ہوا تھا۔ شب خوابی کے ریشمی قیمتی لباس میں وہ مصروف مصروف سا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اس کا ہیئر اسٹائل بہت نفیس تھا۔ شادی سے پہلے بھی وہ اس کے ہیئر اسٹائل سے متاثر تھی۔ اب تو اس نے اپنی مومی انگلیوں سے کئی بار اس کا ہیئر اسٹائل بگاڑ ڈالا تھا۔ کبھی پیار سے، کبھی خفگی سے، کبھی شرارت سے۔ اس نے نظریں ہٹا دیں اور کافی کا مگ تپائی پر رکھ کر وہ تصاویر ٹھیک کرنے لگی۔

معاً وہ خوف زدہ سی ہو گئی۔ جھلسے ہوئے رخسار والی دلہن کی تصویر بڑے اہتمام سے سجی ہوئی تھی۔ اس کے برابر میں ایک اور تصویر تھی۔ ایک آدمی سڑک پر گرا ہوا تھا۔ تمام سڑک خون سے بھری ہوئی تھی۔ اس کے برابر میں ایک آدمی کی تصویر تھی جو درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر کھڑا تھا۔ اس کے سینے میں ایک تیر ترازو تھا اور اس مقام سے خون ٹپک ٹپک کر پاؤں بھگو رہا تھا۔ وہ ایک دم احسن کی طرف پلٹ گئی۔ وہ کافی پیتے ہوئے بڑے غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے پلٹتے دیکھ کر مسکرایا۔

تاب

جی۔ اس نے احسن کو دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی بے رحم سی مسکراہٹ تھی۔

تاب زخم بازو پر ہوں تو چھپ جاتے ہیں۔ پتا ہی نہیں چلتا اور اگر رخسار پر ہوں تو صاف نظر آ جاتے ہیں۔ تاب ادھر میرے پاس آؤ۔

تابندہ کو ایک دم خوف محسوس ہونے لگا۔ وہ پیچھے ہٹنے لگی۔

زندگی یہاں آؤ۔ سچ ایک بہت ضروری بات ہے۔ نہیں سنو گی؟ احسن کا لہجہ بدل گیا تھا۔ وہ تابندہ کے نزدیک آ گیا۔ تاب تم میری شریک حیات ہو۔ تمہارا دعویٰ ہے کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔ تاب مجھے پاگل ہونے سے بچالو۔

جی۔ وہ کانپ کر بولی۔

تاب مجھے پاگل ہونے سے بچالو۔ دیکھو صرف ایک داغ، تمہارے رخسار پر۔

احسن وہ خوف سے مرنے کو ہوگئی۔

تاب صرف ایک داغ، ایک داغ، احسان کردو مجھ پر۔

نہیں احسن نہیں، خدارا کیا ہوگیا ہے آپ کو۔ وہ دہشت زدہ ہو کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

احسن مجھ پر تیل چھڑک دیجئے۔ میرے وجود کو مکمل جھلسا دیجئے۔ احسن میں مرجاؤں گی۔ آپ کو کیا ہوگیا۔ وہ بے بسی سے چیخ چیخ کر رونے لگی۔

تاب میں پاگل ہو جاؤں گا۔ زندگی مجھے اذیت سے نکال دو۔ میرے ذہن سے یہ سب انگارے جھاڑ دو۔ اس کی آواز بدل گئی تھی، لہجہ بدل گیا تھا۔

تاب اس نے اس کی ٹھوڑی انگلیوں سے چھو کر اس کا چہرہ اونچا کیا۔ وہ بے بسی سے پھڑ پھڑانے لگی۔ پھر اس کے حلق سے ایک کرب ناک چیخ بلند ہوئی تھی۔

احسن نے جھک کر منہ میں دبی ہوئی سگریٹ اس کے رخسار پر ٹکا دی تھی۔ وہ گرتی پڑتی زینے سے اتر کر ڈرائنگ روم میں چلی آئی اور قالین پر گر گئی۔ ہچکیوں سے اس کا پورا وجود ہل رہا تھا۔ رو رو کر وہ پاگل ہو رہی تھی۔ ہر مرہم، ہر دوا سے بے نیاز وہ بس روئے جا رہی تھی۔ اتنا روئی کہ ساری عمر میں کبھی نہ روئی تھی۔ روتے روتے جانے کب آنکھ لگ گئی تھی۔ جب اٹھی تو سارے گھر پر دھوپ پھیل چکی تھی۔ احسن جا چکا تھا۔

اس نے آئینہ دیکھا۔ رو رو کر آنکھیں پھوڑا ہو رہی تھیں۔ ایک چھالا اس کے رخسار پر ابھر آیا۔ شکل سے بدشکل ہو رہی تھی۔ اپنی بے بسی کا احساس کر کے اس کی آنکھیں بھر بھر آئیں۔

احسن آپ کو کیا ہوگیا تھا۔ میں آپ سے کبھی بات نہیں کروں گی۔ میں آج ہی کراچی چلی جاؤں گی۔

تابندہ تابندہ... ارے بھئی کہاں ہو۔ چلو بھئی گیارہ بج رہے ہیں۔ میں بازار جا رہی ہوں۔ تمہارا چیک اپ بھی کروا دوں گی ڈاکٹر خالدہ سے۔ نادرہ بھابھی اس تک پہنچتے پہنچتے اپنی بات مکمل کر چکی تھیں۔ وہ آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی۔

اور ہاں ایک خوشخبری ہے تمہارے لئے۔ ایک ملازمہ مل گئی ہے۔ بہت اچھی، ار..... رے...یہ..... یہ تمہارے گال پر کیا ہوا؟ آدھی بات ان کے منہ میں ہی رہ گئی۔

تابندہ نے پلکیں جھکا لیں۔ ایک ہمدرد کو سامنے پا کر اس سے مزید ضبط نہ ہوا۔ وہ ان کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

نادرہ بھابھی کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ارے تابی، تابندہ، میری بہن کیا ہوا؟ بھابھی میں جا رہی ہوں کراچی۔ احسن کی چچی ٹھیک کہتی تھیں۔ اگر میں کچھ دن اور رہی تو اذیت ناک موت مرجاؤں گی۔

ارے، خدا نہ کرے۔ وہ مزید پریشان ہو گئیں۔ اسے بٹھایا، پانی پلایا۔

بات کیا ہے؟ کچھ بتاؤ تو سہی۔

تب ہی تابی نے انہیں سب کچھ بتا دیا۔ بازو کے نشانات بھی دکھائے۔ بھابھی کا دل تڑپ کر رہ گیا۔

کیا شروع سے ہی..... ان چیزوں کا، باتوں کا اظہار نہیں ہوا تھا جو تمہارے والدین نے.....

نہیں بھابھی ہم شروع سے ہی انہیں جانتے ہیں۔ بچپن میں تو سب ان کی باتوں کو ضد اور خودسری پر محمول کرتے تھے۔ ان کے والدین بھی نہیں ہیں۔ اپنے چچا کے پاس رہتے تھے۔ سب سمجھتے تھے شاید اسی وجہ سے، یعنی وہ احساس محرومی کا شکار ہیں۔ ان کی چچی کا روّیہ بھی ان کے ساتھ ٹھیک نہیں تھا۔

تابی ایک طرح سے ان کا روّیہ تمہارے ساتھ اشتعال اور اذیت پسندی کا مظہر ہے۔

میں معین سے بات کروں گی۔ انہوں نے بہت سے پیچیدہ کیس حل کیے ہیں۔

بے کار ہے بھابھی۔ احسن کبھی رضامند نہیں ہوں گے۔ وہ سمجھتے ہیں وہ بالکل نارمل ہیں۔ انہیں کوئی بیماری نہیں، کوئی احساس کمتری، برتری، محرومی نہیں۔

تم فکر نہ کرو، ہمت نہ ہارو۔ تم اس کی بیوی ہو، اس کی بھلائی کے لیے آگے بڑھو۔ اچھا فکر نہ کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ارے اس دنیا میں جو نہ ہو کم ہے۔ اب گھبرانا مت۔ تو پھر چل رہی ہو یا نہیں؟

نہیں بھابھی، میں اس حال اور اس حلیے میں کہیں جاتی اچھی لگوں گی؟

یہ بھی ٹھیک ہے۔ اگر تم نے بازار سے کچھ منگوانا ہو تو بتا دو۔ انہوں نے پوچھا۔

فی الوقت تو یاد نہیں آ رہا۔

اچھا پھر میں چلتی ہوں۔ خدا حافظ۔

خدا حافظ۔

☆

قلزمِ ہستی سے ابھرا ہے مانندِ حیات
اس زیاں خانے میں ترا امتحان ہے زندگی

نادرہ نے اپنے شوہر کو بہت سراسیمگی اور عجلت میں تمام بات بتائی تھی۔

سچ معین میرا تو شاپنگ میں دل ہی نہیں لگا۔ اتنی پیاری، نازک سی لڑکی، اس پر کم عمر اور ناتجربہ کار ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو، خدانخواستہ۔

اتنے دن ہو گئے تمہاری دوستی کو، بتا آج رہی ہو۔

بھئی مجھے کیا پتا تھا۔ وہ تو بالکل نارمل نظر آتے ہیں، دیکھا نہیں آپ نے؟ بس ذرا کم

گو اور تنہائی پسند سے لگتے تھے۔ تو یہ کتنی صابر لڑکی ہے۔ سچ کبھی بھی اس نے مجھے نہیں بتایا۔ احسن آپ کسی طرح معلوم کریں احسن بھائی ایسا کیوں کرتے ہیں۔ سمجھانے کا معاملہ تو سمجھائیں۔ اگر علاج وغیرہ ضروری ہے تو وہ کریں، مگر معین مجھے تو یہ نفسیاتی کیس ہی لگتا ہے۔ اتنی چاہت سے بیاہ کر لائے ہیں، اتنی محبت کرتے ہیں۔ ویسے ہر طرح اس کا خیال رکھتے ہیں مگر دیکھیں تو بھی۔

فکر نہ کرو، میں دیکھوں گا۔ تابندہ کو بھی سمجھانا کہ وہ گھبرائے نہیں۔ انہوں نے مخصوص حلیم انداز میں کہا۔

پھر اسی شام کو وہ چلے آئے۔ وہ آفس سے آ چکا تھا۔ تابندہ کچن میں تھی۔ نادرہ اسے بھی وہاں لے گئیں۔ احسن اور معین باتوں میں مصروف تھے۔

معین بھائی تابندہ کی طرف دیکھ کر بولے۔

یار یہ کوئی پتھر کا مجسمہ نہیں۔ کبھی تم اپنے وجود کے کسی حصے پر سگریٹ داغ کر دیکھو۔

اس نے تابندہ کی طرف دیکھا۔

بھئی، انہیں نہ گھورو۔ انہوں نے شکایت نہیں کی ہے بلکہ ہم نے یہ جلا ہوا نشان دیکھ کر معلوم کیا تو انہیں بتانا پڑا۔ معین جلدی سے بولے۔

آپ لوگ بہت فارغ رہتے ہیں یا پھر دوسروں کے معاملات میں مداخلت کا کچھ زیادہ شوق ہے؟ وہ پل میں اجنبی بن گیا۔ عجیب توہین آمیز انداز تھا۔ نادرہ تو منہ کھول کر ہونق بن گئیں مگر معین اسی طرح تحمل سے بیٹھے رہے۔

جو ایذائیں تم نے تابندہ کو دی ہیں تم جانتے ہو کہ یہ مجرمانہ فعل ہے۔ اس پر سزا بھی ہو سکتی ہے۔ وہ اس طرح بولے گویا احسن ننھا بچہ ہو۔

وہ ماتھے پر سینکڑوں بل ڈالے بہت ضبط سے بیٹھا رہا۔ تابندہ اس کے روّیے پر بہت خجالت محسوس کر رہی تھی۔

معین نے نادرہ اور تابندہ کو اشارہ کیا کہ وہ باہر چلی جائیں۔

وہ باہر برآمدے میں آ گئیں اور دوسری باتوں میں لگ گئیں مگر تابندہ کا ذہن خواب گاہ ہی میں اٹکا ہوا تھا جہاں معین اور احسن بیٹھے ہوئے تھے۔

ایک گھنٹے کے بعد وہ دونوں حیرت سے منہ کھول کر رہ گئیں جب معین احسن کا ہاتھ تھامے باہر آئے اور بولے۔

ذرا ہم ابھی آتے ہیں۔ آؤٹنگ پر جا رہے ہیں تاکہ احسن کا موڈ خوشگوار ہو جائے۔ اس کی بہت ضرورت ہے۔

ان دونوں کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ ان دونوں کو جاتا دیکھتی رہیں۔

بھابھی کچھ دیر بعد چلی گئی تھیں یہ کہہ کر کہ ملازمہ صبح پہنچ جائے گی۔

رات بارہ بجے کے قریب احسن نے دروازے پر دستک دی تھی۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ دروازہ کھولا مگر بولی کچھ نہیں۔ وہ بھی خاموشی سے خواب گاہ میں چلا گیا۔

* * *

کیوں دیکھ رہے ہو مری افسردہ نگاہی

صبح وہ کاموں میں لگی ہوئی تھی کہ نادرہ کی ملازمہ پیغام لے کر آ گئی کہ بی بی کہہ رہی ہیں جب کام چھوڑ کر آ جائیں۔ احسن تو آٹھ بجے سے پیش تر ہی جا چکے تھے۔ وہ دوپٹہ ٹھیک کر کے دروازہ لاک کر کے گھبرائی ہوئی نادرہ کے ہاں چلی آئی۔

خیریت بھابھی وہ حیرانی سے بولی۔

ہاں، میرے میاں نے یاد فرمایا ہے۔ وہ مسکرائیں۔

معین بھائی نے۔ وہ کیوں؟ وہ مزید حیرانی سے بولی۔

آؤ میرے ساتھ۔ وہ اس کا ہاتھ تھام کر اندر آ گئیں۔

السلام علیکم معین بھائی

وعلیکم السلام آؤ بھئی۔ دراصل میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ میں رات کو احسن کو لے کر اپنے کلینک چلا گیا تھا۔ وہ واقعی ذہنی مریض ہے۔

جی۔ تابندہ کا دل دھک سے رہ گیا۔

گھبراؤ نہیں۔ ایک ماہ میں وہ بالکل نارمل ہو جائے گا۔ اسلام آباد میں اس کا آنا بہت مبارک ثابت ہوا ہے ورنہ شاید تمام زندگی یونہی گزر جاتی۔ لو دیکھو، سنو کیونکہ تمہیں بھی جاننا چاہیئے کہ تم اس کی بیوی ہو۔ تحلیل نفسی کے دوران اس نے جو مجھے جواب دیے، سنو۔ انہوں نے ٹیپ ریکارڈر آن کیا۔

معین بھائی کی آواز ابھری۔ پھر احسن کی بھاری آواز، جیسے وہ بہت دور سے بول رہا ہو۔ تابندہ دم بخود بیٹھی سنتی رہی۔ معین کے ہر سوال کا جواب وہ بہت تفصیل سے دے رہا تھا۔

تابندہ نے ساکت ہو کر ایک ایک لفظ سنا۔

سوالات و جوابات کا سلسلہ ختم ہوا تو معین نے ٹیپ آف کر دیا۔

اس نے بتایا کہ اس کے والد سخت غصیلے انسان تھے۔ اس کی ماں کا تعلق ایک غریب خاندان سے تھا۔ اس کے والد اشتعال میں آ کر اکثر زدوکوب و مغلظات پر اتر آتے تھے۔ اس نے اپنی ماں کو بارہا تنہائیوں میں سسکتے دیکھا تھا۔ والد سب ہی کے لیے آمر تھے۔ ماں کی مظلومیت اور اس کی خاموشی کے سبب احسن کی تمام ہمدردیاں ماں کے ساتھ تھیں۔ بارہا احسن کو بھی معمولی شرارتوں پر سخت جسمانی ایذائیں دی جاتی تھیں۔

احسن نے بتایا کہ ایک رات وہ جب وہ جاگ رہا تھا، اس نے ماں کی چیخ سنی۔ وہ سمجھ گیا کہ آج پھر کسی معمولی بات پر ماں کو سزا مل رہی ہے۔ وہ بھاگ کر باہر آیا۔ اس نے خواب گاہ میں جھانکا۔ اس کے والد کے تشدد کے سبب اس کی ماں کے منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے ہاتھ میں پکڑی کسی چیز سے ماں کو زدوکوب کرنا شروع کر دیا۔ جس وقت وہ زخمی ماں پر حملہ آور تھے اس وقت احسن کا جی چاہا تھا کہ وہ باپ کے ہاتھ سے وہ چیز، جو شاید

گلدان تھا، چھین لے اور باپ کو سخت سزا دے۔ ماں کو بچا لے، مگر باپ کے خوف سے وہ کچھ نہ کر سکا تھا۔ بس اس گھڑی کے بعد اس کے ذہن میں ایک گرہ سی پڑ گئی۔ پھر اس کا جی چاہنے لگا، وہ ایک ایک چیز کو توڑ ڈالے، آگ لگا دے۔

اور آج بھی وہ کبھی کبھی اس جنونیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ حالانکہ اسے معلوم ہے، یہ درست نہیں ہے۔ اس کے باوجود وہ خود کو کنٹرول نہیں کر پاتا۔ دوسروں کو ایذائیں پہنچا کر اسے روحانی تسکین ملتی ہے۔ ماں کے مرنے کے بعد تو اس کی کیفیت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا کیونکہ اس کی ماں ٹی بی کی مریضہ ہو کر مری تھی۔ جس کے لیے وہ اپنے باپ کو قصوروار سمجھتا ہے حالانکہ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔

معین نے تحلیل نفسی کے دوران پوچھا تھا۔

کیا تم اس ذہنی عذاب سے چھٹکارا پانا نہیں چاہتے؟ تب اس نے جواب دیا تھا کہ وہ یہ سب نہیں کرنا چاہتا ہے مگر سرزد ہو جاتا ہے اور وہ دل سے اس عذاب سے چھٹکارا پانا چاہتا ہے۔

تابندہ نے بڑے غور سے سب کچھ سنا۔ اس کا دل ہمدردی سے لبریز ہو گیا۔

تابندہ والدین اپنے غلط طرز عمل کے سبب بچوں کو تباہی کے دہانے پہنچا دیتے ہیں اور گھریلو بے سکونی بچوں کے لیے مشکلات پیدا کر دیتی ہے اور دعویٰ یہ ہوتا ہے کہ ان سے زیادہ ان کے بچوں کو کوئی نہیں چاہ سکتا۔ تابندہ یہ کیسی محبت ہے کہ ایک انسان اس طرح زندہ رہنے کہ نہ خوشی محسوس کر سکے اور نہ راحت۔ اس کے ذہن میں جھکڑ چلتے رہیں اور دنیا اسے پاگل قرار دے کر اس پر مزید ظلم کرے۔ یہ ایک انسان پر زیادتی کی انتہا ہے۔ لوگ بچہ سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ ان کی معمولی سی غلطی بچے کی کامیابیوں کے دروازے بند کر سکتی ہے اور ان کی غلطیوں کے سبب بچہ حقیقی زندگی سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ معین بھائی بڑے جذب سے کہہ رہے تھے۔ تابندہ اور خاموشی سے سن رہی تھیں۔

☆

محبت کو محبت سمجھنا تو ناصح، خود محبت کر
کہ ساحل سے کبھی اندازہ طوفان نہیں ہوتا

ایک ماہ گزر گیا تھا۔ کراچی سے فون اور خطوط کا سلسلہ جاری تھا، لوگ اسے یاد کر رہے تھے۔ اس نے بڑی تفصیل سے ماں کو خط لکھا تھا کہ وہ فی الحال نہیں آ سکتی، نہ احسن کو چھٹی مل سکتی ہے۔ انہیں بڑے اچھے ہمسائے مل گئے ہیں جو اس کا بے حد خیال رکھتے ہیں۔

احسن پر معین بھائی واقعی بہت محنت کر رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ احسن بالکل نارمل ہو چکا ہے اور اتنی جلدی نارمل ہونے کی وجہ انہوں نے یہ بتائی کہ وہ خود کو ذہنی طور پر علاج کے لیے آمادہ کر چکا تھا۔ معالج کو مشکل اس وقت آتی ہے جب مریض خود کو صحت مند سمجھے اور

علاج کرانے پر آمادہ نہ ہو اور آمادہ ہو بھی جائے تو دلچسپی نہ لے۔

تم بہت خوش نصیب ہو تابندہ احسن فطرتاً بہت نیک دل اور سادہ ہے۔ بس تم اپنی محبتوں میں کمی نہ کرنا۔ وہ ہمیشہ تم سے گرم جوش محبت کی توقع رکھے گا۔ انہوں نے اٹھتے نصیحت کی۔ وہ تہہ دل سے معین کی ممنون تھی جو اس کے لیے اس قدر خلوص سے کام کر رہے تھے۔

آپ کے لب اور وفا کی قسم
کیا قسم کھائی ہے خدا کی قسم

تابندہ

جی۔

دیکھو بھئی آج جمعہ ہے اور ہم چھٹی منا رہے ہیں لہٰذا ناشتے وغیرہ کے لیے بالکل ڈسٹرب نہ کیا جائے۔

جی اچھا۔ وہ پلاسٹک کے بیگ سے خوبصورت چھوٹے چھوٹے کپڑے کے پیس نکال رہی تھی۔ اس کی طرف سے پیٹھ موڑے نیچے قالین پر بڑی بے نیازی سے بیٹھی تھی۔

تابندہ

جی؟

کیا کر رہی ہو؟

کچھ نہیں بس ایسے ہی۔ اس نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر مسکراہٹ دبائی۔

تابندہ

جی۔ اس مرتبہ اس نے لمبا سانس لے کر احسن کو مڑ کر دیکھا۔

وہ میرا سگریٹ کیس دینا۔

وہ اٹھ کر کارنس پر سے سگریٹ کیس اور لائٹر اٹھا لائی اور اسے دے کر واپس پلٹنے لگی۔

جا کہاں رہی ہو۔ ادھر آؤ، میرے پاس بیٹھو۔

وہ بیٹھ گئی۔ سرخ کڑھائی کے سبز سوٹ میں ڈھیلے بالوں کو بکھرائے اس کے دل میں اتر گئی۔

ذرا وہ بازو دکھانا جو جلنے سے بچا ہوا ہے۔ لاؤ ذرا بیلنس کر دوں۔

تابندہ نے بگڑ کر اس کی صورت دیکھی۔ وہ اس طرح دیکھ رہا تھا کہ اسے ٹوٹ کر حیا آ گئی۔ اس نے اپنا ودھیا بازو پیش کر دیا۔ احسن نے اس دلفریب ادا پر سارا دھواں اسی پر چھوڑ دیا۔

اختتام ------------------------ The End

زینہ ذات کا سفر اور میں

از

رفعت سراج

ناول کا آغاز

شرمندہ میری روح کی سچائیاں ہوئیں
وہ تبصرہ ضمیر نے کردار پر کیا

آنکھ کھول کر اس نے اپنے چاروں اور نظر دوڑائی۔

کشادہ چھت ٹھنڈی ہوا، چڑیوں کی چہچہاہٹ، کوئل کی کوکو، ہلکی ہلکی روشنی میں اس نے اپنے برابر والے پلنگ کی طرف دیکھا تو خالی تھا۔

وہ جلدی سے اٹھ بیٹھی۔ بھور بھیغ جس کی وہ اب آہستہ آہستہ عادی ہو چکی تھی۔

ہاری او۔ چھوری۔ جا اٹھا دے جا کر اب جادی کو۔

ساس کی آواز پر وہ تیزی سے پلنگ سے اتر آئی۔ اس کی نند اسے زینے پر ہی مل گئی۔ وہ اس کی سمت دیکھے بنا نیچے اتر آئی۔

کامن ایدھر کا کوئی نہ ہی جانے۔ ہر بخت اٹھلی رہوے ہے۔ اس کی ساس لسی بلوتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی۔ (یعنی کام کچھ نہیں جانتی ہر وقت فالتو بیٹھی رہتی ہے)

گھر کے مرد باہر جا چکے تھے۔

اس نے منہ ہاتھ دھویا اور مہمانوں کی طرح ایک طرف بیٹھ گی۔ اور کانپتی نظریں اپنی ساس کی سمت کیں جہاں بدمزاجی اپنے عروج پر تھی۔ اس کا دل سہم کر دھڑ دھڑ بجنے لگا تھا۔ سارا دن یونہی لرزتے کانپتے گزرتا تھا۔ شام ڈھلے البتہ اُن کی سانسیں آزادی ہو جاتی تھیں۔ جب وہ تھکا ہارا آتا تھا۔ ہر چند کہ تب بھی وہ اس سے کترائی کترائی رہتی تھی۔ وہ لالٹین جلا کر طاق کی سمت بڑھتی تو اس کی نند بھائی کے سامنے کھانا سجا دیتی۔ وہ اس کی سمت دیکھتا۔ نظروں سے بلاتا۔ وہ دل جھنبھالتی ساس کے نزدیک چولہے کے پاس جا بیٹھتی اور انگاروں سے کھیلنے لگتی۔ انگاروں سے کھیلنا شاید اس کی سرشت میں تھا۔ وہ زینے کے پاس ہی گھڑونچی سے پانی نکالنے لگتی تو پشت سے آواز آتی۔

اماں میں اوپر جا رہا ہوں سونے۔ وہ اس کے پاس سے گزر کر زینے چڑھ جاتا۔ وہ ساس نندوں کے پاس آ کر بیٹھ جاتی۔ نندیں اسے سہیلیوں کے سسرالی قصے سنانے لگتیں ساس کو اپنی جوانی کی حیا اور پارسائی یاد آنے لگتی۔ ناپسندیدہ باتوں کے باوجود وہ سر جھکا بیٹھی رہتی۔ کتنے آنسو بیبسی اور شرمندگی کے سر مژگاں لرزنے لگتے۔ ساس اونگھنے لگتی۔ اس کی نند کروٹ بدل لیتی۔ تب بھی وہ کافی دیر بیٹھی رہتی۔ ان کی پھٹکاروں میں اسے پھر بھی آسودگی ملتی تھی۔ اور وہ جو اوپر تھا۔ اس کا منتظر اس کی عنایتوں پر بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے کو جی چاہتا تھا۔ اس کی محبت اور گرم جوش نظریں اعصابی خلجان میں مبتلا کر دیتی تھیں اس کا رواں رواں پہلو چراتا تھا۔

مجھے مت چاہو مجھے نہ سراہو۔ مجھے اپنے حصے کا عذاب چکھ لینے دو۔

اس کی آنکھیں سولی کی نیند مانگنے لگتیں تب وہ بہ شکستہ قدموں سے زینے طے کرنے لگتی۔

ایک۔ دو تین زینے کوس بننے لگتے۔ فاصلہ لامتناہی۔

وہ بنا چاپ اوپر آتی تھی مگر وہ اسے دل سے سن لیتا تھا۔

آنکھوں پر دھرا بازو ہٹا کر اسے شاکی نظروں سے دیکھتا۔

سارا دن دھوپ میں جلتا ہوں۔ سارا تیرا دامن پھر بھی تنگ ملتا ہے۔

اس کی بات سن کر سارا کا رواں رواں سسکنے لگتا۔ وہ اپنے پلنگ کی سمت جاتے جاتے اس کی جانب آ جاتی اور اس کے پاس بیٹھ جاتی۔

یوسف۔ آپ مجھ سے اس طرح خفگی سے بات نہ کیا کریں۔ میں اپنا حرف حرف آپ کو پڑھوا چکی ہوں۔ پھر بھی آپ۔

اس کے آنسو روانی سے رخساروں پر بہنے لگتے۔ وہ بازو کے سہارے تھوڑا سا اٹھ بیٹھتا۔

سارا۔ تجھے یقین کیوں نہیں آتا۔ میرا اندر باہر بالکل ایک جیسا ہے۔ میں نے تجھے اپنایا ہے۔ ثواب کمانے کے لئے نہیں حشر میں ملنے والے کسی انعام کی خاطر نہیں۔

میں نے تیرے اصل میں جھانک کر دیکھا ہے۔

یوسف میرا اندر بہت شور مچاتا ہے۔ یوسف جب میں اتنی گنہگار نہیں ہوں تو مجھے دوہرے عذاب کیوں ملے ہیں۔ لوگ مجھ پر یقین کیوں نہیں کرتے میرے امی۔ پاپا۔

گویا میں بھی عذاب ہوں تمہارے لیے۔ یوسف تم پر آ کر گویا سنجیدگی کو چھو گیا۔

نہیں یوسف آپ تو میرے محسن ہیں۔ اس نے تشکر کے احساس سے مغلوب ہو کر اس کے مضبوط ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

دیکھو سارا تم میری نیت پر شک کر کر کے ایک دن مجھے کھو دو گی کیوں مجھے روز تنگ کرتی ہو۔ میں دیہاتی ہوں سارا۔ میری زبان مرد کی زبان ہے۔ جو میرے دل میں ہوتا ہے وہی زبان پر، پڑھی لکھی ہو کر بھی تم میری بات کی تہ تک نہیں پہنچ پاتیں۔

چاند کی کرنوں نے اس کے اشکوں کی روانی خوب ظاہر کر دی تھی۔

وہ اب بھی رو رہی تھی۔

وہ روز اسے اپنی سچائی اور نیک دلی کا یقین دلاتا تھا۔

مگر نفسیاتی مضامین پڑھی بات اپنے دل سے نہ نکال پاتی کہ مرد یہ بات برداشت نہیں کر پاتا کہ اس کی بیوی کا ماضی کسی غیر مرد سے ایک لمحے کو بھی منسوب رہا ہو۔

بعض اوقات وہ گھبرا کر روتی تھی۔

بعض مرتبہ پچھتا کر روتی تھی۔

کئی مرتبہ اس کے ظرف، اس کی شدید محبت پر روتی تھی۔ وہ زچ ہو جاتا تو وہ ڈر بھی جاتی تھی۔

جیسے پھر خفا ہو گیا تھا۔

آپ اس طرح ناراض ہو جائیں گے۔ تو میرا ہارٹ فیل ہو جا گا۔ وہ اس کے شانے چھوتی۔

عجیب لڑکی ہو بات کروں تو مصیبت چپ رہوں تو مشکل۔ وہ مسکرا کر سیدھا ہو جاتا۔

یوسف مجھے سوا عزت کے کچھ نہیں چاہیے۔ اور عزت۔

وہ یوسف کے شانے سے ٹک کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ شیشے تو ٹوٹ چکے ہیں یوسف۔ وہ اس کے شانے تھپتھپاتا۔

اگر سارا تو میری بیوی نہ ہوتی تو میں تیرے ہر وقت بہتے آنسو بہانے کو تیرے من کا چور جان لیتا۔ تیرے ضمیر کی چبھن کہہ دیتا۔ تیرے شیشہ عصمت میں لکیر دیکھتا مگر تو میری بیوی ہے۔ اور میں آنکھوں اندھا مرد نہیں ہوں۔ شوہر سے زیادہ اپنی بیوی کو کوئی نہیں جانتا۔ وہ بیوی کی عصمت کا معتبر گواہ ہوتا ہے۔ تجھے چھو کر خدا کی قسم۔ ایک بار کوئی بیایمان خیال میرے دل میں نہیں آیا۔ تجھے یقین کیوں نہیں آتا؟ سارے کھوٹ مرد برداشت کر سکتا ہے۔ مگر شاید یہی ایک کھوٹ ہے۔ جو اس کے ظرف سے بڑا ہوتا ہے۔

میری طبیعت کا اطمینان تیرے دل کو تسلی کیوں نہیں دیتا۔ کیوں وہم کی آگ میں جلتی ہے۔

وہ پھر خوش قسمتی کی باد نسیم بن کر اس کے اعصاب کو سکون بخشنے لگتا۔

وہ ایک بار پھر تیرہ بختی کے ناگوں کو زیر کرتی نئی صبح کی جانب چل پڑتی۔

وہ سب اپنے اپنے دھندوں کی سمت مڑ چکے تھے۔

لمبی اور گرم گرم دوپہر عفریت کی طرح اس کی سمت بڑھنا ہی چاہتی تھی۔

پرسوں ہی تو اس نے ساس سے کہا تھا۔

اماں۔ ان کے لیے کھانا میں لے کر جایا کروں گی۔

بڑی بی نے اس کی سمت تعجب سے دیکھا پھر سخت ناگواری سے اس کی سمت دیکھنے بنا کہا تھا۔

دیکھ چھوری کوئی جروت (ضرورت) نہیں گھر سیا ہر نکلنے کی۔ رحم کر بابا۔ پہلے چار آ گئے تھے اٹھان واسطے اب بارہ آ گئے پھر؟

گلے گلے پانی میں اتارنے کو اس کے لیے یہ بات کافی تھی وہ وہیں پتھر کی بن گئی تھی۔

جبکہ یوسف نے خود ہی اسے کہا تھا۔

بھری دوپہر میں جب میں شہتوت کی چھاؤں میں تیری راہ دیکھتا ہوں اور تو نہیں آتی۔ بھری دھوپ سر پر اتر آتی ہے۔ کیوں نہیں آتی؟ رات تو بہت دین سے آتی ہے ناں؟

تب اس نے سوچا تھا وہ اسے چھاؤں دے گی۔

مگر بڑی بی نے اب ہمیشہ کے لیے اس کی زبان بند کر دی تھی۔

پھر اس نے اماں کی یہ بات یوسف سے کہہ دی تھی۔ وہ سادہ سا نوجوان ماں کی بات پر تو چپ ہو گیا تھا۔ لیکن ایک صبح جاتے ہوا سے چپکے سے کہہ گیا۔

اماں اپنے بھائی سے ملنے ساتھ والے گاؤں جا رہی ہے میں انتظار کروں گا۔

اور بھری دوپہر میں جب اس کی نند عائشہ کھیت پر جانے لگی۔ بڑا سا کپڑوں کا گٹھڑا اٹھا کر

اور ساتھ ہی بھائی کا کھانا لے کر تو وہ لپک کر اس کے پاس چلی آئی۔

عائشہ میں بھی چلوں تمہارے ساتھ؟

ہاں ہاں بھابھی ضرور۔ اماں بی تو تو بس ایویں ہی ڈر پڑ گیا ہے۔ چلو مل کر نہر پر کپڑے دھوئیں گے۔ وہ خوش ہو کر بولی۔

تب اس نے کھانا اٹھا لیا۔ چادر اچھی طرح لپیٹ کر وہ نند کے ساتھ باہر آ گئی۔

شہتوت کی چھاؤں میں بچھی چارپائی پر وہ بازوؤں کا تکیہ بنا غالباً راہ دیکھ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر آنکھوں میں کرنیں اتر آئیں۔ وہ کھانے سے زیادہ چادر سنبھال رہی تھی۔ یوسف نے دیکھا سارے چلنے میں دقت ہو رہی تھی۔ وہ پنسل ہیل والے سینڈل پہنے ہوئی تھی۔ غالباً اس کے پاس سادہ چپل نہیں ہے پتہ نہیں اس کے پاس کیا نہیں ہے؟ اور کیا ہے کتنا لاپرواہ ہوں میں بھی۔ اسے تاسف ہوا۔

وہ قریب آ گئی تھی۔ چادر ایک دم ڈھلک گئی وہ بوکھلا سی گئی۔ کھانے کے برتن بھی ہاتھ میں تھے۔ اس کی نند نہر کی سمت مڑ گئی تھی۔

وہ اٹھ آیا اور کھانا اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

سرخ پھولدار سوٹ میں کچھ سورج کی تپش سے اس کے رخسار دہک اٹھے تھے۔

وہ وہیں کھڑی ہو کر چادر سنبھالنے لگی۔ یوسف نے اس کے سراپے پر حقدار نظر ڈالی اس کا شباب دیہاتی لڑکیوں جیسا تھا۔ اور روپ سے بے نیازی بھی انہی جیسی۔

اماں نے تمہیں قید کر دیا ہے۔ ہے ناں؟ وہ اس کو پڑھنے لگا۔

وہ جن باتوں سے بچنا چاہتی تھی وہی سامنے آ جاتی تھیں اس کا ماضی برہنہ رقصاں ہو جاتا۔

ایسا بھی کیا بھلا۔ میرا تو برا ہی ہے دیکھنے کو ترس جاتا ہوں، گھر جاؤں تو عائشہ چھیڑنے لگتی ہے۔ اماں کو برا لگتا ہے۔ رات کو آدھا وقت تمہارے رونے اور سمجھانے میں گزر جاتا ہے۔

میں عائشہ کے پاس جاؤں اس کے ساتھ کپڑے دھلوانے ہیں۔

ارے تمہیں کہاں ان باتوں کی عادت ہوگی۔ دھو لے گی خود ہی۔ اب اتنا بھی شرمندہ نہ کرو۔

عادت تو ڈالنا پڑے گی ساتھ جو رہنا ہے آپ کے۔ اس کی آواز دھیمی ہو گئی۔

(مجھے تو مشین سے کپڑے دھوتے کوفت ہوتی تھی یوسف بعض اوقات چھٹی والے روز امی صبح ہی سے کہنا شروع کر دیتیں۔ سارہ مشین لگا لو بہت کپڑے جمع ہو گئے ہیں۔ اور میں

آنسوؤں کے پھندے اس کے حلق میں اٹکنے لگے۔ مجھے کیا پتا تھا۔)

میں جاؤں نہ؟ وہ اس کی خوبصورت گہری آنکھوں میں امڈتی مردانگی سے نپٹا کر دوبارہ بولی۔

نہیں۔ وہ خاموش ہو رہی وہ کھانا کھانے لگا۔

اس نے کھیتوں کے چاروں طرف نظریں دوڑانا شروع کر دیں۔

یہ کھیتوں کے ایک سرے پر کوٹھری سی کیوں بنی ہوئی ہے؟ اس نے سادگی سے پوچھ لیا۔

شہتوت کی چھاؤں زیادہ ٹھنڈی ہے۔ اس کے انداز میں شرارت تھی۔

اور اس سے سر نہ اٹھایا گیا۔

یہ کھیتوں پر راکھی (رکھوالی) کرنے والے ہوتے ہیں ناں ان کے لیے بنا دیتے ہیں۔ بارش وغیرہ سے بچنے کے لئے راکھی کرنے والا وہاں چلا جاتا ہے اور دھوپ تیز ہو اور پاس یہ سایہ نہ ہو تو بھی وہ اندر جا کر لیٹ جاتا ہے۔

راکھی کرنے والا رکھوالی تو آپ۔

شہر گیا ہوا ہے وہ۔ آ جائے گا دو چار دنوں میں تب تک تو میں ہی

وہ بات ادھوری چھوڑ کر مسکرا دیا۔

وہ آ جائے گا تو میں شہر چلا جاؤں گا۔

آپ؟ وہ متعجب ہوئی۔

ہاں۔ میری ملازمت بھی ہے وہاں اور اس سال میں سی ایس ایس کے امتحان میں بھی بیٹھ رہا ہوں۔

وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ سول سپیریئر سروس۔

وہ اس طرح اسے دیکھ رہی تھی گویا اس کے وجود پر شک ہے آ۔ آپ۔

کیوں۔ کیا۔ ہم دیہاتیوں کو اعلیٰ امتحانات دینے کا حق نہیں ہے؟

نن نہیں۔ میم۔ میرا مطلب ہے۔ آپ!؟

مجھے فوج میں جانے کا بیحد شوق تھا۔ مگر کچھ مجبوریوں کی وجہ سے نہ جا سکا۔ سوچا پولیس آفیسر ہی بن جاؤں۔

وہ بے یقینی کی کیفیت میں اسی طرح کھڑی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی کہ وہ۔

اس نے ادھر ادھر دیکھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

ڈونٹ ڈاؤٹ اٹ۔ اٹ از ٹرو۔ (شک نہ کرو یہ سچ ہے)

اس کا تو گویا ہارٹ فیل ہوتے ہوتے رہ گیا۔ اتنی روانی اور شستہ انگریزی ماموں جان نے یہ تو بتایا تھا کہ وہ پڑھا لکھا ہے وہ یہی سمجھی اتنا ہی پڑھا لکھا ہوگا۔ جتنا عام دیہاتی نوجوان پڑھ لکھ لیتے ہیں۔

آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا؟

ایسی کوئی خاص بات تو نہیں یہ، موچی کا بیٹا امریکہ کا صدر بن سکتا ہے تو کیا ایک دیہاتی نوجوان اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کر سکتا۔

دوسرے شاید میں تمہیں آزما بھی رہا تھا کہ ایک پڑھی لکھی لڑکی ہو کر تم میرے ساتھ کیا رویہ اپناتی ہو۔ وہ سادگی سے مسکرایا اس کی آنکھوں میں آنسو تیر گئے۔

آپ تو ہر طرح سے ایک اعلیٰ انسان ہیں۔ پھر مجھے کیوں قبول کر لیا۔؟

کیوں تم میں کیا کمی ہے۔ ہر طرح سے مکمل ہو۔ تم انتقام اور ریا کاری کی بھینٹ چڑھائی

گئیں۔ اگرچہ عورت کا یہ جرم ناقابل معافی ہوتا ہے مگر فیصلہ صادر کرتے وقت کوئی حکم لگاتے وقت انسان کا باطن بھی پڑھ لینا چاہیے۔ میں مرد ہوں مگر اس معاشرتی ناانصافی پر کڑھتا ہوں۔ وہ تباہ کاری میں تہائی حصہ دار ہوتا ہے۔ پھر تمام تر سزا عورت کے حصے میں کیوں آتی ہے۔

جب بابا نے مجھ سے کہا کہ میں تم سے شادی کرلوں۔ تم ان کے دوست کی بیقصور بھانجی ہو۔ سچ ستارا میرے دل نے اسی وقت انکار کر دیا تھا۔

میں بھی اور مردوں کی طرح برتی ہوئی جھوٹے برتن جیسی عورت اپنانے کا ظرف نہیں رکھتا۔ مگر مجھے یقین دلایا گیا تم اس ظلم کی حقدار نہیں ہو جو تم پر کیا جا رہا ہے۔ تم اب بھی بیلکیر آئینہ ہو۔

تمہیں ورغلانا چاہا تھا۔ ہارنے کی صورت وہ تمہارے لیے سراپا انتقام بن گیا۔

بابا نے مجھے یہ بھی کہا تھا۔ دنیا جو دیکھ رہی ہے سن رہی ہے اسی کو سچ کہے گی۔ ایک بیگناہ لڑکی خواہ مخواہ ماری جا رہی ہے۔

میں پھر بھی مشکوک تھا مگر میرے باپ کو مجھ سے زیادہ شاید اپنے دوست سے محبت تھی۔

انہوں نے میری ماں کی مخالفت کے باوجود اپنی بات ایک رکھی۔

میں تمہیں بددلی سے بیاہ کر لایا تھا ستارا۔

مگر اب احساس ہوتا۔ جاہل وہ نہیں جو ان پڑھ ہوتا ہے جاہل وہ ہے جو بغیر تحقیق کے بات جھٹلاتا ہے۔

میرا دل پھر بھی بیایمان رہا۔ حالانکہ تمہارے وجود میں سے میں نے سچائی بھی کھوج لی تھی۔

میں نے تمہارے ذہن پر دستک دی تھی۔ مرد بڑا خود غرض ہوتا ہے۔ وہ اپنی بیوی کے پور پور روم روم دماغ کی لہر میں صرف خود کو چھپایا ہوا دیکھنا چاہتا تھا۔

میں نے سوچا وہ جو تمہیں اس مقام پر ڈال گیا۔ منظر سے ہٹ کر زمین پر قابض تو نہیں؟

میں شرمندگی کے ساتھ یہ سچ کہہ رہا ہوں۔ یہ مرد کی مخصوص فطرت ہے۔ جو بدلی نہیں جا سکتی۔ مرد اگر جہاندیدہ ہو تو ایک نظر میں عورت کو پڑھ لیتا ہے۔ میں نے پڑھ لیا تھا۔ اب آئندہ ہم اس موضوع پر بات نہیں کریں گے ستارا۔

میری خوش نصیبی ہے کہ شہر کی پڑھی لکھی اور حسین لڑکی مجھے کتنے آرام سے مل گئی ورنہ اماں تو بیاہ لاتی کوئی ان پڑھ بھانجی بھتیجی۔ وہ مسکرایا۔

وہ پھر اس کے روکے سے نہیں رکی اور عائشہ کے ساتھ کپڑے دھلوانے لگی۔ جو نہر پر تختہ بچھا کر بری ترنگ میں کپڑے دھو رہی تھی۔ وہ گھر واپس ہوئی تو اس کی شامت تیار کھڑی تھی۔

اری چلی گئی تھی۔ خبر ہے مجھے تیرے چلتروں کی۔ نامراد تجھے تو عادت ہے مرد ذات کے پیچھے پھرنے کی۔ چار دن ہو بیاہی کو۔ آ گئے وہ تیرے لگے سگے ڈولی لے کر؟

عائشہ تو ماں کے غیظ میں دیکھ کر جھٹ یوسف کو بلانے بھاگ گئی تھی۔

اری بدجات منی ہیرے جیسا چھوڑا اور تو کیڑا لگا اناج۔

بڑی بی کا بس نہیں چل رہا تھا اس کا ٹینٹوا دبا دیں۔

وہ بھی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ (آہ وقت کی چال)۔

اماں یوسف کی بھاری اور خشک اواز اس کی پشت سے ابھری تو وہ کانپ کر اس کے ساتھ جا کھڑی ہوئی۔

کیا بات ہے اماں؟ کیوں اس پر گرمی کھا رہی ہو؟

ارے یہ بڑی ہیر بنی پھر رہی ہے اسے اپنی عجت کی پروا نہیں تو ہماری عجت تو کرے۔

ارے تیری بیوی ہے۔ سارے گاؤں میں ہماری عجت ہے کیا کہیں گے سب اگر اٹھا لے گئے اس کے۔

اماں یوسف کی آواز مارے جذب کے کانپ گئی۔

غلط نہیں کہہ رہی میں، توکل کا چھوڑا تجھے تو کر لیا اس نے اپنے بس۔

بس اماں۔ اب اور کچھ نہیں میں لے گیا تھا اسے اپنے ساتھ اکیلی تھی گھر میں۔

ارے کیوں اپنی جان گنوا گا اس کوڑے پیچھے۔

اماں۔ میں کا سے لے کر چلا جاؤں گا یہاں سے۔

ارے لے جا اس دن رات کے کلینی کو، تیرے باپ نے تو مجھ سے خورے (خبر نہیں) کون سے جنم کا بدلہ لیا ہے۔ ایک سے ایک کنواری چھوری تجھے مل جاتی۔

یہ بھی کنواری ہی تھی۔ یوسف کی آواز شدت جذب سے لرزنے لگی تھی۔

ارے جا میرا منہ نہ کھلوا۔

اری تجھے جو بولا تھا۔ ناں کھیتن پہ نہیں جانا، بیاہ سے پہلے اٹھا لے جاتے تو اور بات تھی ارے کیا یہ بچائی ہوئی تھوڑی سی عجت ارے میں تو دے دوں گی تیرے گلے میں انگوٹھا اگر اب کے باہر نکلی۔

یوسف اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے سامنے کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ بھی مرے مرے قدموں سے اس کے پیچھے ہو لی۔

دیکھو سارا اماں پرانے وقتوں کی وہمی عورت ہے۔ ان کی باتوں کا خیال نہ کیا کرو۔ جو کچھ ہوا ہے وہ اسے اس سے بھی بڑھ کر سمجھتی ہے۔

گھٹی گھٹی سسکیاں اور رکے رکے آنسو بے اختیار ہو گئے۔

وہ اسے چند ثانیے ایک ٹک دیکھتا رہا پھر اس کی چادر کے پلو سے اس کی رخسار پونچھ ڈالے۔

بابا اور غلام بخش (نوکر) رات تک آ جائیں گے صبح میں چلا جاؤں گا۔ گھبرانا نہیں۔ میں تو اماں کے سامنے پھر بھی بےبس ہو جاتا ہوں لیکن بابا۔ بہت خیال رکھیں گے تمہارا۔ میں ساڑھے چھ بجے والی لاری سے لاہور چلا جاؤں گا تم اپنا خیال رکھنا۔ کوئی تمہارا کوئی نہیں بگاڑ سکتا۔

آپ چلے جائیں گے، مجھے اماں سے بہت ڈر لگتا ہے۔

میں نے کہا ناں بابا۔ وہ تو تجھے بیاہ کر لا ہیں۔ بہت خیال رکھیں گے گھبرا مت سارا خدا کے لیئے۔ دسمبر میں مقابلے کے امتحان میں بیٹھوں گا۔ میرے لیئے دعا کیا کرنا۔ ڈرنے کی بات بھی کیا ہے تمہارے ماموں بھی اسی گاؤں میں ہیں۔

وہ اسے طفل تسلیاں دے کر باہر چلا گیا۔ وہ یہ سوچ کر رونے لگی۔ اب بری بی پھر شروع ہو جائیں گی۔ مگر شاید یوسف نے کچھ کہا تھا۔ رات تک خیر گزری اس نے بھی سوچ لیا وہ آج یوسف کے سامنے کوئی آزردہ بات نہیں کرے گی۔ اسے پریشان نہ کرے گی۔ صبح ساڑھے چھ بجے لاری سے اسے چلے جنا ہے۔

رات کو اس کے سسر آ گئے تھے۔ داتا دربار سے لایا ہوا تبرک اس کے ہتھ میں دیا سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی تو اس کی ڈھارس بندھ گئی۔

تجھے یہاں کسی نے پریشان تو نہیں کیا؟ مجھے زیادہ دن لگ گئے لاہور میں۔

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہو سوچا۔ بابا میرا مقدر تو پگلی کے بالوں کی طرح پریشان ہے۔

مجھے شادابی صحن چمن سے خوف آتا ہے

یہی دن تھے کہ لٹ گئی تھی زندگی اپنی یوسف کے جانے کے بعد اس کا کام پہروں سوچنا رہ گیا تھا۔

اس اپنی خوبصورت اور مصروف مصروف سی ماں بیانتہا یاد آتی تھی۔ کاغذات کے پلندوں میں گھرا بیاندازہ سنجیدہ اور کم گو باپ۔ وہ جوانی کے منڈیروں سے جھانکتا۔ بڑا سنجیدہ کم چھوٹا بھائی سمیع اور اس سے چھوٹا بے انتہا شرارتی اور نٹ کھٹ سا وسیم وہ خوبصورت سی چھوٹی سی گڑیا جس نے نیا نیا اسکول جانا شروع کیا تھا۔

وہ بھی ان کے درمیان کبھی چہلیں کرتی پھرتی تھی الھڑ اپنے گھر اور گھر والوں سے بیحد انسیت تھی۔ بڑی ہونے کے ناتے چھوٹے بہن بھائیوں کو ڈانٹتی ڈپٹتی امی کی ڈانٹ سن کر کام نبٹاتی۔ وہ کیسا خواب ساز زمانہ تھا۔ ہر وقت کھل کھلاتی رہتی تھی تفریح کی شوقین فلموں گانوں کی رسیا۔ اس کا الہڑپن اس کے روم روم سے چھلکتا تھا۔

وہ اسار نثار تھی۔ جس کی لاتعداد سہیلیاں تھیں۔ اسے نئے نئے فیشن لبھاتے تھے۔ اسے خوش رہنا آتا تھا۔ اور جو کہا کرتی تھی۔

میں دکھ گرا نگی سیکو کر اماں خورشیدہ کے دروازے پر چھوڑ آئی ہوں سنتے ہیں۔ اس کے دکھ کم نہیں ہوتے،

تب ساری سکھیاں قہقہہ مار کر ہنس پڑتیں۔ سب مجھ سے اس لیے بھی پیار کرتے تھے کہ اس کی شکل بھی پیار کے قابل تھی۔ اور اسے خوش رہنا اور خوش رکھنا آتا تھا۔

امی کی ڈانٹ پر اس نے کبھی برا منہ نہیں بنایا تھا۔ ڈھٹائی سے ہنستی رہتی تھی۔

ماں کو اس کی مسکراہٹوں سے بڑے وہم آتے تھے

خدایا اس کا مقدر ایسے ہی رکھنا ہنستا مسکراتا۔ بظاہر اسے ڈپٹتی تھیں۔

بیوقوف لڑکی ہر وقت نہیں ہنسا کرتے۔ لڑکیوں میں کچھ سنجیدگی بھی ہونا چاہیے۔

امی اسے کام بتا کر جاتیں وہ اوندھی پڑی ناولز بنایا کرتی ان کی جان جل جاتی۔ کبھی ان کا موڈ آف ہو جاتا۔

چھٹی کے دن وہ پائنچے چڑھا کر پھر ایسے کام میں جت جاتی کہ انہیں ترس آنے لگتا۔

ارے فرش تو آمنہ دھولے گی، تم مشین لگا لو کپڑے بہت جمع ہو گئے ہیں۔

فکر نہ کریں امی کپڑے بھی دھو لوں گی۔ بس ہفتے بھر میں ایک ہی دن کام کیا کرو۔

سسرال میں ایسے نہیں چلے گا۔ سب مجھ کو کہیں گے۔ اس کی بھی فکر نہ کریں میں انہیں ہفتے کو کلوروفام اس طرح سنگھا دیا کروں گی کہ اگلے جمعے تک پڑے سوتے رہیں جمعہ کی صبح کو اٹھ کر دیکھا کریں گے تو میں کام میں مصروف ملا کروں گی بڑے خوش ہوا کریں گے۔

بدتمیز۔ امی کو بیساختہ ہنسی آ جاتی۔

کوئی آیا گیا پوچھا کرے گا تو کہوں گی یہ پندرہویں صدی کے اصحاب کہف ہیں۔ جمعہ کی مبارک صبح اٹھ کر دنیا کے اتار چڑھاؤ ملاحظہ کرتے ہیں۔

امی کی ہنسی روکے نہ رکتی۔

بہت وبان چلنے لگی ہے تیری۔

وہ اپنے اسی انداز میں سر پٹر پھر کراتی

لبوں کو لاکھ تبسم سے باز رکھ لیکن
تیری تو آنکھیں بہت مسکرانے والی ہیں

کالج جانے کے لیے صبح جب اسٹاپ پر کھڑی ہوتی تو اپنے دائیں بائیں کھڑے لوگوں کو دیکھ کر اسے گدگدیاں ہونے لگتیں بڑے برجستہ جملے ذہن میں کلبلاتے ان کی حرکتوں کا بغور مشاہدہ کرتی۔ کسی کا پان چبانے کا اسٹائل اس پر تیل چپڑے بالوں والا سر۔ دل ہی دل میں ان کے لیے کوئی نام سوجھ جاتا۔

کسی کا سڑک پار کرنے کا انداز دیکھ کر اسے مسکراہٹ دبانا مشکل ہو جاتی۔ کسی کا مطلوبہ بس دیکھ کر دیوانہ وار دوڑنا۔ اسے گویا گدگدیاں ہونے لگتیں۔

ماہر نقال کا تو اسے پہلے ہی خطاب مل چکا تھا۔ کالج پوائنٹ آنے تک وہ عمیق مشاہدے میں مصروف رہتی۔ اسٹاپ پر وہ اتنی بیخبر ہوتی کہ معلوم ہی نہیں ہوا کہ جب وہ دوسروں کے مشاہدے میں مصروف ہوتی ہے۔ تو کوئی بغور اس کا مشاہدہ کرتا ہے۔

آپ کی گھڑی میں کیا ٹائم ہوا ہے؟

اس نے چونک کر اپنے دائیں جانب دیکھا۔ انتہائی کڑوی سی نظر ڈالی تھی۔

وہی جو ریڈیو پاکستان کی گھڑیوں میں ہوا ہوگا۔

مرا مطلب ہے میری گھڑی بند ہے۔

گھر سے چلا کر نکلا کریں۔ ویسے آٹھ بج کر پانچ منٹ ہو ہیں۔

اب اتنی بھی الھڑ نہیں تھی۔ مردوں سے اس کا رویہ محتاط ہی رہتا تھا۔ یہ اسکی ماں کی تربیت کا خاص حصہ تھا۔

پوائنٹ آنے پر وہ لپک کر اس میں چڑھ گئی۔

ریسز میں اس نے سکھیوں کے بیچ میں بیٹھ کر آج کے تازہ مشاہدات بیان فرما۔ ٹائم پوچھنے والی بات انہیں ہنس ہنس کر بتائی۔

ایسا جواب دیا موصوف کو بغلیں جھانکنے لگے تھے۔

لڑکیوں سے بات کرنے کا بہانہ ڈھونڈے ہیں۔ صبا نے ٹکڑا لگایا۔

اور اس سے تو خاص طور پر ڈھونڈتے ہوں گے۔ آسیہ نے اس کے صبیح چہرے کو رشک سے دیکھا۔

اچھا تم زیادہ مت بنایا کرو۔ اس نے فائل اٹھا کر اس کی کمر پر رسید کی۔

کیا ملے گا تجھے، بکھرے ہو ہو خوابوں کے سوا
ریت پر چاند کی تصویر بنانے والے

وہ حسب عادت سب کے مشاہدے میں مصروف تھی۔ ادھر ادھر نظر دوڑاتے ہوا اس کی نظر اسٹاپ پر لگے درخت سے ٹیک لگا اس شخص کی سمت گئی بیحد پرشوق نظروں سے دیکھ رہا تھا وہ جانے کیسی نظر تھی۔ جو اس کے اعصاب سلا گئی حاضر دماغی کو مات دے گئی۔

ہونہہ بن ٹھن کر ایسے نکلتے ہیں جیسے کہیں کے لارڈ ہوں اور سوٹ پہن کر بسوں میں دھکے کھاتے ہیں۔ اسے بروقت یہی تبصرہ سوجھا۔

اسے شاید معلوم نہیں تھا کہ براؤن بش شرٹ جس کا میرون کالر اور اسی رنگ کی آستینوں پر لگی پٹی پھر ان میں سے برآمد ہوتے ہوئے دودھیا بازو سفید شلوار سفید دوپٹہ جو وہ پیشانی تک منڈھ لیتی تھی۔ دوپٹے کی حد سے باہر اس کا گلابی شوخ و شریر خیالات کا عکاس چہرہ کسی کو پاگل بنانے کے لیے کافی تھا۔

اس نے پوائنٹ رکتا دیکھ کر تیز تیز قدم بڑھا دیے اسی دم وہ بھی ٹیکسی روک کر اس میں بیٹھ چکا تھا۔ کالج پہنچنے کے بعد حسب دستور وہ سب کچھ فراموش کر چکی تھی۔

آج اس نے سہیلیوں کے سامنے اس واقعہ کو گول کر دیا وہ کون سا شوخی میں ان سے کم تھیں تنگ کر کرے رکھ دیتیں۔

اگلی صبح اس نے شعوری طور پر دائیں بائیں دیکھا۔ دیر ہو گئی تھی۔ بس نکل چکی تھی۔ اسے رکشے وغیرہ سے جانا تھا۔ پاپا اس سے پہلے روانہ ہو چکے تھے۔ ورنہ وہی چھوڑتے ہوئے چلے جاتے جانے کیوں اس کا دل دھڑک گیا وہ بڑے اطمینان سے کش لگا رہا تھا۔ روز کی طرح ڈیل ڈول اور اس سے کتنا قریب کھڑا تھا۔ وہ اس کی خوشبو شدت سے محسوس کر رہی تھی۔

بس اسٹاپ سنسان ہو چکا تھا۔ سامنے روڈ پر البتہ کچھ لوگ آ جا رہے تھے لوگوں کے کام پر روانہ ہونے کا وقت صبح ہی صبح ہوتا ہے۔

معاف کیجیے گا مس۔

اس کی سمت دیکھ۔۔ اسے زہر لگا۔

یہ کتاب اس بینچ پر پڑی ہوتی تھی کل۔ اس نے ایک طرف لگے بینچ کی سمت اشارہ کیا۔

غالباً آپ کی یا آپ کے ساتھ جانے والی کسی لڑکی کی ہے۔ کتاب اہم بھی ہے اور قیمتی بھی ہے۔ اُس نے کتاب کی سمت دیکھا بائیو کیمسٹری کی ضخیم کتاب تھی،

یہ میری نہیں ہے۔ اس نے سرد مہری سے کہا۔

اس پر نام لکھا ہے آپ کی کسی ساتھی طالبہ کی ہو سکتی ہے۔

لیجیے بھئی جس کی بھی ہو دے دیجیے گا۔ عجیب قطعی سا انداز تھا اس نے کتاب تھام لی وہ فوراً اس کے پاس سے ہٹ گیا۔

اسی روٹ کی ویگن جو کالج کی سمت جاتی تھی آ کر رکی تو وہ لپک کر چڑھ گئی۔

باہر کی سمت اس نے نہیں دیکھا پھر۔

کلاس میں سیٹ پر بیٹھ کر اس نے کتاب کھول کر دیکھنا چاہا اندر سفید لفافہ تھا۔ جس پر سرخ روشنائی سے لکھا تھا۔

آپ کے لیے۔

اس کی پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے چمکنے لگے۔

دل دھڑکا تھا بڑے زور سے یہ اس کے ساتھ بڑا اچھوتا اور پہلا واقعہ تھا۔ اس نے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔

کیا بات ہے سارا۔ میڈم کی آواز میں تشویش تھی۔

تھنک میڈم۔ وہ خفیف سی ہو گئی اسے خیال ہی نہیں رہا تھا۔ وہ سب سے اگلی رو میں ہے۔ یہ اگلی سیٹ اس کی سکھی اس کے لیے گھیر کر رکھتی تھی۔

اس دن وہ اس قدر گم صم رہی کہ پورے گروپ کو اس کی طبیعت وصحت کے متعلق تشویش ہو گئی۔ اس کا ذہن اسی سفید لفافے میں اٹکا ہوا تھا۔ اس میں کیا ہے۔؟

پڑھوں کا بنا پڑھے پھاڑ دوں۔ تمام دن اسی ادھیڑ بن میں گزر گیا۔

رات کو وہ اپنے کمرے میں آئی دھڑکتے دل سے لفافہ کھولا۔ اس کے مومی ہاتھوں میں لرزش تھی۔ اندر سے سادہ سے سفید ہی کاغذ پر سیاہ روشنائی میں کچھ رقم تھا۔ بسم اللہ یوں تھی۔

سب تعریفیں اس خدا کے لیے ہیں جس نے اس خوبصورت کائنات اور آپ کو بھی بنایا۔

پرنس

تمام نیک تمنائیں فقط آپ کے لئے۔

کہنا بہت کچھ ہے۔ سمجھ کچھ نہیں آ رہا۔ سوچتا ہوں گاڑی خراب ہونا میرے لیے مسعود ہی ٹھہرا دو دن گاڑی ورکشاپ میں رہی تیسرے دن آ گئی تھی۔ اس کے باوجود میں ٹیکسی سے گیا۔ اس لیے کہ بنا بات کیے کیسے رہ جاتا؟ جو مجھ پر گزرتی ہے اس کا اندازہ آپ کر ہی نہیں سکتیں۔

آج اگر آپ تک اپنے جذبات پہنانے میں کامیاب ہو گیا۔ تو بہت سا بوجھ سینے سے سرک جاگا۔ المختصر آپ کو گنوانا نہیں چاہتا۔

اگر خدا اتنا حسین روپ دے تو نقاب لگا کر نکلتے ہیں۔ یوں پاگل نہیں بناتے پھرتے۔

سمجھیں؟ اگرچہ بہت عامیانہ حرکت ہے۔

اگر آپ کا گھر دیکھنے کے لیے آپ کا تعاقب کرتا تو ذلیل ہونے کا بھی خطرہ تھا۔

بہر حال معزز آدمی ہوں۔ فقط اعتماد اور اس نظر کا طالب جس کے لیے شاہ تخت گنوا دیتے ہیں۔

منوچہ آفتاب

یہ تحریر تھی یا ایٹم بم اتنی شستہ اردو میں خط اتنا خوبصورت تاہم اس نے پہلی بار پڑھا تھا۔

اس نے خط مٹھی میں بھینچ لیا۔ خوف اور شرم سے اس کا پورا وجود لرز رہا تھا۔

کیا کروں اس کا۔ اس نے خط کی سمت دیکھا۔

پھر دروازہ کھول کر باہر آئی کچن میں جا کر اس نے خط جلا دیا گویا اپنی حفاظت کر لی۔ اب وہ بخوبی سے سو سکتی تھی۔ پر نیند کہاں؟

شجر کو سبز دیکھ کر یہ الجھن ہے
کہاں یہ رنگ نمو کہاں پہ زہر کا رنگ

وہ بیحد محتاط ہو کر چلنے لگی تھی اسٹاپ پر کھڑے ہو کر ادھر ادھر دیکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ اگر کوئی کار اس کے نزدیک دھچکے سے رکتی تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آ جاتا۔

جوانی محتاط نہیں ہوتی۔ ڈر اور خوف میں تو تربیتیں بولتی ہیں۔ اس عمر میں سب ایک ہی کتاب پڑھتے ہیں۔ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی یہ کتاب سب پر الہام ہوتی ہے۔ یہ کتاب کھلی اور بیباک ہوتی ہے۔ سب اسے حجاب کے بند کواڑ کے پیچھے پڑھتے ہیں۔ بچے کو پانچوں حسیوں کے کلمے سکھا جاتے ہیں۔ قرآن پڑھایا جاتا ہے۔ اٹھنے بیٹھنے کھانے پینے بولنے چالنے کے آداب سکھا جاتے ہیں۔ سکھانے والا سکھاتا ہے وہ سیکھتا ہے۔ ایک حد تک اکتساب کرتا چلا جاتا ہے۔ پھر ایک دن اسے سوچوں کے بیچ ایک نیا راستہ دکھتا ہے۔ اسی دن سے یہ عام اور خوبصورت اور بیحجاب کتاب الہام ہوتی ہے۔ کھلا کھلا سمجھانے والے مبہم انداز میں سمجھانے لگتے ہیں۔ حد بندیاں باندھنے لگتے ہیں۔ جو طبیعت کو ناگوار گزرنے لگتی ہیں۔ اسے بھی امی کے اعتراضات بیجا لگنے لگے تھے۔ ان کی فہمائش پر منہ پھول جاتا اس کا جی چاہتا کہ جو اس کا دل کہہ رہا ہے اسے کرنے دیا جائے۔

اس کی ماں محتاط اور حساس تھی۔ اسے احساس تھا اسکی بیٹی کا حسن و شباب غیر معمولی ہے۔ جسے اس کی بے نیازی نے دو آتشہ کر دیا ہے۔

بڑی دور تک ماں کی تربیت اسے پکڑنے آئی۔ مگر تربیت سے زیادہ وقت کی اڑان تیز تھی شاید۔ کافی کوس ماں کی نصیحتیں اسے گھیرنے آئیں۔ جنہیں اس نے کار کے چار پہیوں کے نیچے کچل دیا۔

اس نے ایک دن اسے واپسی میں جا لیا تھا۔ اور ایک رول کیلنڈر دے کر کار آگے بڑھا دی تھی۔

اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ سب بڑی تیزی سے آ جا رہے تھے۔

پھر ویسی ہی گرم رات چکر کھا کر آئی۔

اس نے پھر کمرہ بند کیا۔

کیلنڈر کھولا چار پانچ صفحات پر مبنی کیلنڈر تھا۔ وہ صفحے الٹنے لگی۔

سینوی کے دوسری جانب سیاہ روشنائی سے تحریر تھا

شروع اس خدا کے نام سے جس کے روبرو آج کل میری پلکیں دعاؤں سے نم رہتی ہیں

پرنس خدا تمہیں اس سے بھی زیادہ توفیق دے جو میرے ساتھ ہو رہا ہے۔ بہت سے لوگوں کے ساتھ ایسا ہوا تم لوگوں کے دل ہمیشہ پتھر کہے گئے۔ اور یہ غلط بھی نہیں۔

تم مجھے عام سا لوفر سا آدمی سمجھ رہی ہو گی۔ مگر تم انجان ہو آخر تم تک آنے کا کوئی رستہ بھی تو ہو۔

میں ایک معزز آدمی ہوں لیکن تمہاری خاطر کتنی نیچی سطح پر آ گیا ہوں۔ میں چوراہے پر گاڑی میں تمہارا انتظار کروں گا۔ اگر تم نہ آئیں تو میں کبھی تمہاری راہ میں نہیں آؤں گا۔ اور آئندہ شاید برسوں بعد سینی ٹوریم سے مخاطب ہوں۔ اپنی سچائی دکھانے کے لیے کہ تم بے داغ ہو جو مجھے کینسر کی طرح زچ کرے گا۔ بنانے والا تمہیں میرے خاندان میں بھی تو بنا سکتا تھا۔

یوں ہر راہوں میں تمہاری جھلک دکھا کر غالباً اس نے میری قسمت میں خوار ہونا لکھا ہے

منوچہر آفتاب

اس نے کیلنڈر کا وہ صفحہ نکالا اور ڈسٹ بن میں جلایا۔ دیر تک جلتے شعلوں کو دیکھتی رہی۔

ان شعلوں تربیت جل رہی تھی۔ اکتساب بھی پھنک رہا تھا۔

وہ اس کچی عمر کی لڑکی میں وہ جذبہ بیدار کر چکا تھا۔ جو عورت کو بہتا لاوا بنا دیتا ہے۔ جو عورت کو نابینا کر دیتا ہے۔ بادشاہ سے بیوفائی کی جرات دیتا ہے۔ جس پر گل صنوبر میں بیوفا ملکہ کو اس کے محبوب کے سر سے کیڑے جھاڑ کر اس میں کھانا شامل کر دیا جاتا ہے۔ اگرچہ وہ کبھی کی جائیدان نہیں تھی۔ مگر وہی جذبہ خود کر آ چکا تھا۔ جس نے ملکہ کو آگ پر چلنے کا حوصلہ دیا تھا۔ ایک مقتدر شخص سے بیوفائی کی جرات دی تھی۔ وہی جو گل صنوبر میں ملکہ نے بادشاہ کے ساتھ کیا تھا۔ اس نے ماں باپ کیساتھ کرنے کی ٹھان لی۔

اس نے مصمم ارادہ کر لیا وہ چوراہے کی سمت ضرور جائے گی۔ وہ اسے نہیں گنوائے گی۔

اہل طلب یاں وفا اجنبی سہی
لگتا ہے صرف شوق کا آغاز آشنا

ہر ارے غیرے کے لیے ایک لڑکی میں یہ جراتیں نہیں آتیں بہترین سوٹ ہیرے کے کف لنکس آنکھوں پر نہایت قیمتی گلاسز پھر بہترین ہنڈا اسوک موٹر کار۔ سب سے بڑھ کر انتہائی گریس فل اور ہینڈسم اور کوئی کھلنڈرا نو جوان بھی نہیں تھا۔ تیس کے پیٹے میں تو ہو گا ہی۔ اس کے دل میں تو اس احساس نے گدگدیاں پیدا کر دی تھیں کہ وہ اس کی خاطر اس طرح پریشان پھرتا ہے۔ اس قدر صاحب حیثیت اور گریس فل شخص۔ دونوں خط اس کے بھرپور جذبات کے عکاس تھے۔

اس نے مردہ قدموں سے آتی ہوئی سارا کو دیکھ لیا تھا۔ فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔

بات سنیں۔ مم میں صرف یہ کہنے آئی ہوں۔ جو کچھ آپ کر رہے ہیں۔ میرے حق میں اچھا نہیں ہے۔ میں نظروں میں آسکتی ہوں۔ اس کے صبیح رخسار دہک اٹھے تھے۔ نظریں مسلسل جھکی ہوئی تھیں۔ یہ واقعتاً اس نے دل کی بات بولی تھی۔

مجھ پر اعتماد کرو۔ گمنام لڑکی۔ بلکہ پرنس۔

اف۔ سینے کے اندر دل کی علیحدہ اچھل کود جاری ہوگئی۔

پلیز مجھے یوں تماشا نہ بناؤ۔ اس نے کار میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

نن۔ نہیں میں گاڑی میں نہیں بیٹھوں گی۔

تو پھر میں تمہارے ساتھ پیدل ہی چلتا ہوں۔ اگر تمہیں کار میں بیٹھنا پسند نہیں۔ لوگ ہماری سمت متوجہ ہو رہے ہیں۔ اس نے دیکھا واقعی کچھ لوگ کھڑے ہو کر معاملہ سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کے تو چھکے چھوٹ گئے۔

وہ جلدی سے اندر بیٹھ گئی اور زور سے دروازہ بند کیا مبادا لوگ یہ سمجھیں کہ اس کے ساتھ زبردستی کی جا رہی ہے۔ الٹے لینے کے دینے پڑ جائیں۔

وہ فوراً بیٹھ گئی تھی۔ مگر اب اندرونی صورتحال سے بوکھلا بھی رہی تھی۔ دہشت بھی تھی۔ حالانکہ دل کو جانے کیوں اس اجنبی شخص پر اعتماد سا ہو چکا تھا۔

وہ کتابوں کی سمت نظریں کیے رہی۔

جیسا کہ تعارف ہو چکا ہے میرا۔ کہ مجھے منوچہر کہتے ہیں۔ میکینیکل انجینئر ہوں وہ بھی ضرورت کے تحت نہیں محض اپنی شناخت کے لیے میرے آباؤ اجداد کا تعلق مشہور امراء و نوابین سے ہے۔ اسے عامیانہ پن نہ سمجھیے گا۔ بلکہ تعارف ہی کا ایک حصہ سمجھیے۔ دراصل خاندانی پس منظر ایک بہت اہم چیز ہوتی ہے۔

وہ دھیمے دھیمے بول رہا تھا۔ بھاری اور جذبات کو گرماتی ہوئی آواز۔

بعض اوقات چیز ساری دنیا جہان مارنے کے باوجود نہیں مل پاتی۔ بعض اوقات بس اسٹاپ پر مل جاتی ہے۔

اس کی طبع نازک پر اس کا جملہ ناگوار گزرا۔

میں چیز نہیں ہوں۔ یہ وہ نخوت سے ناک چڑھا کر بولی۔

جانتا ہوں۔ وہ گویا اس کی تنتائی ہوئی ادا پر مر مٹا۔

اتنی دیر میں اس نے ایک بار بھی منوچہر کی سمت نہیں دیکھا تھا۔ بات بزدلی اور کم ہمتی کی نہیں نظروں کی گرمی کی تھی۔ جو اُن کی برداشت سے باہر تھی۔

میں تم سے تمہارا تعارف چاہوں گا۔ چائے پینے اور کھانا کھانے کے لیے کہوں گا تو شاید تم اس پر برا مانو۔

نام نہیں بتاؤ گی؟ ثنارا نثار۔ وہ مختصراً بولی۔

والدین بھی ہیں الحمدللہ۔ دو بہنیں دو بھائی۔

بھائی بڑے ہیں؟

نہیں۔

یہ کون سے ایر میں ہو۔؟

اسے یہ بات بہت کھل رہی تھی کہ وہ چھوٹتے ہی تم سے بولا تھا اور مسلسل بول رہا تھا جیسے اس کی کوئی حیثیت نہ ہو۔ اور وہ شاید اس لیے کر رہا تھا کہ عمروں کے درمیان کافی تفاوت تھا۔

بتایا نہیں کس ایر میں ہو؟

تھرڈ ایر اسٹارٹ ہے؟

کم بولتی ہو؟

اس نے منوچہر کی سمت دیکھا۔ وہ پوری طرح سامنے متوجہ تھا۔ اس کے مضبوط ہاتھوں نے اسٹیرنگ تھام رکھا تھا۔ ہاتھوں کی بناوٹ و چہرے کی شفاف جلد سے اسکی خوشحالی اور فارغ وقتی کا پتہ مل رہا تھا۔

اس کے لب بھینچے ہوئے اور تیز گلابی تھے۔ بالائی لب تو مونچھوں سے آدھا ڈھک چکا تھا۔ آنکھیں گھور سیاہ اور ہیرے کی کنی کی طرح چمک رہی تھیں۔ سارے سراپے میں اسے اس کی آنکھیں کچھ زیادہ ہی غیر معمولی محسوس ہوئیں۔

اسے قطعی محسوس نہیں ہو رہا تھا کہ وہ اس سے پہلی مرتبہ اتنا قریب ہوئی ہے۔ یا اس سے پہلی مرتبہ تعارف ہوا ہے۔ رتی برابر اجنبیت اسے محسوس نہیں ہوئی تھی۔ وہ چھوٹتے ہی ایسے بولا گویا کوئی بہت پرانا تعارف ہو۔

میں صرف اسٹاپ جانتا ہوں۔ گھر کس سمت ہے؟

اوہ۔ وہ چونک پڑی۔ وہ اسے اس کے اسٹاپ تک بھی لے آیا تھا۔

نہیں شکریہ۔ بس یہیں۔ گھر اتنے قریب دیکھ کر سارا نشہ ہرن ہو گیا۔

شکریہ تو مجھے ادا کرنا چاہیے۔

تھینک یو سو مچ۔ ڈار پرنس۔ آدھا لفظ کھا کر جھٹ پرنس کہا۔ وہ اپنی دھن میں تھی نہ

اس نے ڈارسناہ پرنس

اس سے ملے تو زعم تکلم کے باوجود
جو سوچ کر گئے تھے وہی اکثر نہیں کہا

سارا۔ سنو آج ایسا کرو چھٹی کر لو۔

امی آج تو میرا پریکٹیکل ہے۔ وہ گھبرا کر بولی۔

پریکٹیکل تو تمہارے روز ہوتی ہے۔ وہ کچن میں جاتے ہوئے بولیں۔

لیکن امی آج تو بہت اہم پریکٹیکل ہے۔ چج میڈم بہت ڈانٹتی ہیں بھئی۔ دنیا کو بیٹیوں سے کس قدر آرام ہوتا ہے۔ مگر تم کبھی وقت پر کام نہیں آئیں۔ وہ ہلکی سے خفگی سے بولیں۔ آپا جان سپر سے آ رہی ہیں۔ دوپہر کے کھانے پر اہتمام ہوگا۔

شام کو کر لیں گے۔ امی۔ وہ دلار سے بولی۔ میری اچھی امی پلیز۔

ہاں بس اتر آؤ خوشامدوں پر۔ اچھا بابا جاؤ۔ کرلوں گی میں خود میں تو اس خیال سے اور بھی۔ خیر جاؤ۔

وہ ماں کا نارمل موڈ دیکھ کر خوش خوش تیار ہو کر اسٹاپ کی طرف چل دی۔

آخری بلاک کے بعد وہ مڑی تو دل بڑے زور سے دھڑکا اس کی خوبصورت کار اسٹاپ سے تھوڑے ہی فاصلے پر کھڑی تھی۔ فرنٹ ڈور کھولے سر جھکائے وہ پائپ میں تمباکو بھر رہا تھا۔ اس کا جی چاہا وہ واپس ہولے۔ جانے کیوں اس کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ ضمیر کل کی خجالت پر برافروختہ تھا۔ شاید شریف خون اتنی آسانی سے اپنا باطن ختم نہیں کر پاتا۔

اس کی چال سست ہو گئی تھی۔ اس کا دل کہہ رہا تھا۔ وہ اس لاجواب شے کو نظر اٹھا کر دیکھنے سے باز نہ رہ سکے گی۔ اور جب وہ اس کی سمت دیکھے گی تو ڈھے جاگی۔ پھر اس کی سوچ کے ہر دروازے پر قفل پڑ جائیں گے۔

اس نے دیکھا تھا۔

اور اس نے پائپ منہ سے نکال کر نظر سے روک لیا تھا۔ وہ انگارہ انگارہ چلتی فرنٹ سیٹ پہنچی

اس نے دروازہ پورا کھول دیا تھا۔ اس کا انداز حتمی تھا وہ بیٹھ گئی۔

اس نے اس گریس فل آدمی کے چوری سے دیکھا جو اپنی خوبصورت اور بولتی پکارتی آنکھوں پر گلاسز چڑھا چکا تھا۔

مجھے معلوم نہیں تھا کہ کل کی مختصر ملاقات اس قدر تشنگی دے گی کہ۔ سرِ راہ چلنے والے کبھی اتنے اچھے بھی لگا کرتے ہیں۔

اس کی آواز آنچ دے رہی تھی وہ قطرہ قطرہ پگھلنے لگی۔

میں کئی برس یورپ میں گزار چکا ہوں۔ میری ڈھیروں کزنز کولیگز ہیں۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا ہو گیا ہے۔

اور وہاں تمہارا شکریہ کہ تم نے مجھ پر اعتماد کیا۔

میں چاہتا ہوں تم مجھ سے واقف ہو جاؤ۔ تاکہ میں تمہیں تمہارے والدین ------ سے مانگوں اور وہ بھی انکار کرنا چاہیں تو تم میرا ساتھ دو۔

تم محض میری پسند نہیں ہو۔ سب کچھ ہو۔

وہ کھلنڈری لڑکی اندر کے طوفان کو دبانے لگی۔

تم کچھ نہیں بولوگی؟

کیا بولوں؟ وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔

کچھ بھی سہی۔ کہنا تو چاہیے ناں۔ میرے متعلق۔

میں آپ کی کار میں بیٹھی ہوں۔ یہ کافی نہیں ہے۔

اعتبار ہے ناں مجھ پر۔؟ انشااللہ یہ قائم رہے گی۔ سنو آج کا دن مجھے دے دو۔

تمام دن۔؟ وہ گھبرائی۔

تمام دن۔ اس نے موڑ کاٹا۔ میں تم سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔

وہ۔۔ میری امی۔ اس نے ہکلاتے ہوئے کچھ کہنا چاہا۔

اس کی آنکھوں کے تاثرات پر سیاہ پردے تھے۔ لیکن ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ رینگ گئی۔ وہ پھر گڑبڑا سی گئی۔ پندرہ برس کی تھی جب میٹرک کیا تھا۔ سترہواں ختم ہوا تو انٹر بھی کر لیا۔ بی۔ ایس۔ سی کا پہلا سال تھا اور اٹھارویں کا آغاز۔ عقل تو عمر کے حساب سے جو تھی سو تھی اس لیے کرتا دھرتا ماں کے ہوتے ہوئے غیر ذمہ داری کا انداز وہ کم از کم بھی تیس کے لپیٹے میں ہوگا۔

اس نے شاید ایسے ہی باوقار مرد ساتھی کی غیر لاشعوری آرزو کی تھی۔ ورنہ لڑکے تو بہت تھے خاندان میں بھی اور خاندان سے باہر بھی مگر اس طرح کے احساسات سے وہ کبھی دوچار نہ ہوئی تھی۔

اندر کا انسان باہر کے انسان سے بہت آگے ہوتا ہے۔ اندر فیصلے ہو جاتے ہیں۔ لاشعور کے زینے پھلانگ کر دماغ میں پختہ خیال بننے تک کوئی سفر ہو جاتا ہے۔ شاید اس کے اندر نے فیصلہ کر لیا تھا۔ طلب کی پہچان کر لی تھی۔ وہ تین دن اسٹاپ پر آیا تھا تین میں اس باطن نے تیزی سے سفر کر کے اس کے شعور کو پختہ کر دیا تھا۔ یہ ہر انسان جس عمر میں ہوتا ہے اپنے شعور کو پختہ سمجھتا ہے۔

وہ سوچ چکی تھی۔ کہ جو اس کے سامنے آیا ہے۔ دوبارہ نہیں آئے گا۔ وہ ملالی میں زندہ رہنا نہیں چاہتی تھی۔ اسے خوش رہنا اچھا لگتا تھا۔

اس نے جان تو نہیں مانگی تھی۔ دن مانگا تھا اور شاید دل بھی۔

اس نے دے دیا۔ کہ دن محض اس کی جائیداد نہیں تھا۔ محض چشمہ تھا۔ اس چشمے کو۔ فیض کا چشمہ بنا دیا۔

اس کے پیچھے اس قسم کی کوئی روایت نہیں تھی۔

روایت انسان ہی بناتے ہیں۔

اس نے بنا دی۔

میں اتروں گی نہیں۔ کوئی دیکھ لے گا۔ کتنے روایتی خوف اس نے دودھ میں پیے تھے۔

یہ ساحل ہے۔ لوگوں کی بھیڑ ہے۔ میں چاہتا ہوں ہم میں انڈر اسٹینڈنگ ہو جا لوگ ایسے ایسے گھناؤنے کام محبت کے نام پر کرتے ہیں کہ یہ لفظ اپنی حقیقت کھو بیٹھا ہے۔ جو چیز میں تمہارے لیے اپنے دل میں محسوس کرنے لگا ہوں۔ اس کا نام کچھ اور رکھوں گا۔ چلو ریت پر ٹہلتے ہیں۔ آؤ پلیز۔

اف یہ انسان ہے یا۔ وہ حواس کھو بیٹھی۔ وہ اس کی سوچ سے بڑھ کر تھا۔

وہ اسے نہیں گنوائے گی۔

رات وہ شخص میرے خواب میں تھا
عکس جس کا ہر اک گلاب میں تھا

جب وہ گذر میں داخل ہوئی تو ساڑھے تین بج چکے تھے۔ گھر میں داخل ہو کر تو ایسا محسوس ہوا۔ جیسے ہر ایک اس کو نظروں سے ٹٹول رہا ہے۔

بتایا تھا تمہیں کہ آپا جان آ رہی ہے۔ پھر بھی دیر سے آئی ہو۔ امی نے ہلکی سی خفگی کا اظہار کیا۔

وہ خاموشی سے شوز اتار کر جرابیں کھینچنے لگی تھی۔

اور ہاں۔ یہ بے پروائی اور بد سلیقگی آپا جان کو نہ دکھانا ذرا طریقے سے رہنا۔

آج وہ جرم کے جوہڑ سے پائنچے چڑھا کر نکل آئی تھی۔ ماں کے سامنے خاموش رہی ورنہ دل تو بہت چاہا تھا کہ پوچھے۔

ایسے کیا سرخاب کے پر لگے ہیں آپا جان میں یعنی ہماری خالہ جان میں۔

وہ اٹھی خاموشی سے کپڑے بدلے کھانا کھایا۔ امی نے بتایا تھا کہ خالہ جان کھانا کھا کر نماز ظہر کے بعد قیلولہ فرمانے اوپر جا چکی ہیں۔

اس نے تو شکر ہی ادا کیا خود بھی تھوڑا سا کھا کر سو گئی۔ تھکن کی وجہ سے اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں کیونکہ اسے دوپہر کو سونے کی عادت تھی۔

پانچ بجے کے قریب سمیع نے اس کے تاریک کمرے میں آ کر لائٹ جلائی تھی۔

آپا اٹھو نا۔ خالہ جان کہہ رہی ہیں۔ بہت سوتی ہے یہ لڑکی۔ امی کا تو سخت موڈ خراب ہے۔ مجھے بھیجا ہے کہ اٹھا دوں۔

ہاں سوتے رہتے ہیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

اف خدایا انگلیوں پر ورم آ گیا ہے چلتے چلتے۔ نئے جوتے بہت تنگ کرتے ہیں۔ اس کی نظر اپنے دودھیا پیروں کی انگلیوں پر گئی۔

کیوں کیا آج کالج میں کرکٹ میچ تھا؟

نہیں تو بھئی۔ وہ پاؤں ہلکے ہلکے دبا کر بولی۔

اچھا میں سمجھا تھا سب سے زیادہ رنز آپ نے بنائے ہیں۔ جلدی سے اتر آئیں اب بستر سے۔

وہ دوپٹہ شانوں پر پھیلا کر سستی سے چلتی ہوئی باہر آئی کچن کے سامنے ہی کرسی ڈالے خالہ جان امی جان سے باتوں میں مصروف گفتگو تھیں۔ اسے دیکھتے ہی چونک گئیں۔

السلام علیکم۔

وعلیکم السلام۔ جیتی رہو۔ ارے ماشاءاللہ کیا قد نکالا ہے۔

ارے ساجدہ۔ ماشاءاللہ۔ بیٹی تو بس تمہاری ہی نکلی ہے ایک۔ انہوں نے اسے بازوؤں میں بھر لیا۔ اور اس کی پیشانی چوم لی۔

ہاں۔ بس آپا جان یہ آپ اور اس کا دماغ خراب کر دیں۔

امی نے بیٹی کے بے حد حسین چہرے کی سمت دیکھا اور دل ہی دل میں ماشاءاللہ کہا۔

منہ ہاتھ دھو کر اس نے ماں کے ساتھ مل کر کھانا پیار کیا۔ اپنی مخصوص نفاست اور پھرتی

سے۔ ان کا موڈ خوشگوار ہو گیا۔ انہیں یہ دھڑکا تھا کہ بہن ان کی بیٹی کو بدسلیقہ نہ سمجھ لیں۔ آخر وہ اکلوتے لائق فائق بیٹے کی ماں تھیں۔ ساری زندگی بہن سے بنی تھی۔ وہ ساجدہ کے لیے خصوصی وسیع دامن رکھتی تھیں۔ کچھ عمروں میں تفاوت کچھ ساجدہ کا ان کے لیے ادب و احترام ان سے زیادہ سارا کو کون عزیز رکھ سکتا تھا۔ ان کی معصوم اور چاند چہرہ بیٹی جس کے لیے وہ بظاہر بہت سخت تھیں لیکن شاید سب سے زیادہ اس کے لئے اپنے دل کو نرم پاتی تھیں۔

خالہ جان کے حد درجہ التفات سے اسے وحشت ہونے لگی تھی۔

منصور تو مجھے عرصے سے ٹال رہا ہے۔ کچھ ہو جاؤں۔ بن جاؤں۔ خدا نے اٹھائیس برس پہلے بنا کر بھیجا تھا۔ اب کیا بتا کس چیز کی کمی ہے؟

وہ دور دور بکھرتی سارا پر سو سو جان سے نثار ہوتی رہیں۔ رات پھر آئی وہ دبے پاؤں چھت پر چڑھی تھی۔ اس سے پہلے کبھی چاندنی کی خوبصورتی محسوس نہ ہوئی تھی۔ صرف سر میں قلم چلا چلا کر نوٹس بنانا اور پڑھنا آتا تھا یا پھر امی کی ڈانٹ کھا کر ہنسنا آتا تھا۔ یا پھر تارا کا خوبصورت کا ہیئر اسٹائل بنانا اس کو خوبصورت فراکیں پہنا کر اسے ہر زاویے سے دیکھا کرتی اور چوم چوم کر اس کے رخسار سرخ کر دیتی۔

اور اب تو تارا نے اسکول جانا شروع کر دیا تھا۔ صبح ہی صبح وہ اس کی دو چھوٹی چھوٹی پونی ٹیلز بناتی۔ صاف ستھرا یونیفارم پہناتی۔ صاف اور چمکتے سیاہ جوتے، پاپا اسے چھوڑتے ہو جاتے تھے۔ تارا کی انگلی تھام کر وہ باقاعدہ گاڑی تک لاتی تھی۔ رات کو اس کا ہوم ورک چیک کرتی تھی۔

آج اس نے تارا کا یونیفارم بھی نہیں دیکھا نہ ہی اس کا ہوم ورک چیک کیا۔ ابھی وہ یونہی گیٹ تک آئی تھی۔ جاند کو اس نے پام سے جھانکتے دیکھا تھا۔

اسے محسوس ہوا چاندنی خاص چیز ہے خاص لمحوں کی ٹھنڈی چھایا۔

وہ دیوانگی جو انسان کو نشہ سا دیتی ہے۔ اس دیوانگی کو چاندنی اور بڑھا دیتی ہے۔

وہ دبے پاؤں اندر آئی تھی۔

اس کا جی چاہا تھا وہ چاندنی کی سمت اپنے تخیل کو پرواز کرے اور چاند میں۔ منوچہر آفتاب کو دیکھے۔ وہ انسان جو دوسرے لوگوں سے کس درجہ ممتاز تھا۔

کس قدر پراسرار اور بیحد گریس فل۔

اس نے فون نمبر تو دے دیا تھا لیکن منع کر دیا تھا۔ وہ اس کو ورق ورق پڑھنا چاہتا تھا۔ اس نے کہہ دیا کہ وہ اس سے فون پر کچھ بھی نہ کہہ سکے گی وہ اسے کیسا لگتا ہے۔ وہ کے بارے میں کیا سوچتی ہے لکھ کر کہہ دے گی۔ وہ اس کی بات مان بھی گیا تھا۔

اب وہ سوچنے آئی تھی کہ اسے کیا لکھے۔

اس کو نہیں معلوم تھا ان راستوں پر چلنے والوں کو غیب سے مضامین آتے ہیں۔ محبت نامے میں بعض اوقات وہ الفاظ بھی آ جاتے ہیں۔ جو کسی لغت میں بھی نظر نہیں آتے۔ مگر ماورائی جذبوں کے عکاس ہوتے ہیں۔ وہ دیر تک منڈیر پر کہنیاں ٹکا سامنے گھورتی رہی۔

سوچتی رہی۔ پھر اپنے کمرے میں چلی آئی۔ پاپا کا رائٹنگ پیڈ اٹھا کر لکھنا شروع کیا۔

منوچہر آفتاب

آداب

سچ آپ نے مجھے سخت الجھن میں ڈال دیا ہے سمجھ میں نہیں آتا کیا لکھوں۔ یہی کہ آپ کی باتیں سب سے الگ ہیں۔ آپ میں گریس ہے۔ آپ میں ڈگنیٹی ہے۔ جب آپ پہلی بار میری راہ میں آ تو میں نے حیران ہو کر سوچا کہ یہ شخص ظاہری طور پر تو کوئی کھلنڈرا و بیدیاز لڑکا نہیں لگتا لیکن حرکت۔ آپ کا کہنا بھی بجا۔ اگر یوں بہانے نہ کرتے تو سرا ہاتھ کیسے آتا۔ میں نے کبھی کسی کو خط نہیں لکھا، قلم یہ سوچ کر بھی اٹھایا ہے کہ آپ کو بتا دوں میں ایک گرل فرینڈ کا کردار ادا نہیں کر سکتی، آپ کا ساتھ چاہیے مگر قانونی۔ آپ مجھے سیر سپاٹے کی شوقین لڑکی مت سمجھیے، اپنے والدین کو سیڑھی بنا لیجیے۔ اور مجھے آئندہ کبھی باہر ملنے کو نہ کہیے گا۔ اس دن اگر میں آپ کی بات نہ مانتی تو تماشا بن جاتی سب کے سامنے کسی کے ساتھ زبردستی کرنا اچھی بات نہیں ہے نا سمجھ رہے ہیں ناں آپ؟ رات کا ایک بج رہا ہے ٹوٹ کر نیند آنے لگی ہے خدا حافظ

سارا

اس نے خط لفافے میں بند کیا اس پر منوچہر کا دیا ہوا ایڈریس لکھا اور اپنے بیگ میں ڈال دیا۔

درحقیقت اسے نیند بالکل بھی نہیں آ رہی تھی۔ وہ بستر پر لیٹ کر بھی سوچوں میں گم تھی۔

رگوں میں قرب کے لمحوں کا زہر چھوڑ گیا
جو ایک شہر میں قاتل تھا شہر چھوڑ گیا

اب وہ دھڑکتے دل سے گھر سے باہر نکلی تھی۔ اس کی موٹر بہت دنوں تک اس نے نہیں دیکھی تو جیسے گویا اس کا سب کچھ کہیں کھو سا گیا۔

دل کو ڈھیروں وہم آ۔ بھلا کسی اجنبی پر یوں بھی بھروسا کیا جاتا ہے۔ مگر اس نے پتا تو دیا ہے مگر اس پتے پر لکھے خط کا جواب بھی نہیں آیا؟ وہ اس قدر مضطرب اور بےچین تھی کہ ہر کام بھول بیٹھی ایسا لگتا گویا وقت کا کوئی مصرف ہی نہیں رہا ہر چیز بے کار ہر بات غیر ضروری محسوس ہوتی تھی۔ بہن بھائیوں کے چہرے اسے محض ہیولے لگنے لگے۔ امی کا کسی کام کو کہنا انتہائی ناگوار محسوس

ہوتا۔ خالہ جان کی محبت پاش نظریں، دیکھ کر تلووں سے لگتی اور سر پر بجھتی تھیں۔ جی چاہتا کوئی اسے نہ بلائے کوئی کسی کام کو نہ کہے اگر وہ اکیلے اور اندھیرے کمرے میں بیٹھی ہو تو کوئی آ کر اسے ڈسٹرب نہ کرے اپنے گروپ سے علیحدہ کٹ کر رہنے لگی تھی۔ جنرل ورکنگ کا بہانہ بنا کر لیبارٹری کے ایک کونے میں بیٹھ جاتی۔ مزاج تلخ سا رہنے لگا تھا۔

صرف چار دن تو گزرے تھے کہ یہ صورت حال تھی۔

کالج سے واپسی پر وہ وسیم سے پوچھتی۔ وسیم۔ پوسٹ مین آیا تھا؟ وہ بیزاری سے شانے اچکا کر بھاگ جاتا۔

آج اس صورتحال سے دوچار ہوئے پانچواں دن تھا۔

مغرب کی اذان ہو چکی تھی، خالہ جان وضو کر کے جائے نماز بچھا رہی تھیں۔ امی غالباً وضو کر رہی تھیں۔ پاپا مسجد جا چکے تھے۔ اور سمیع شاید اکیڈمی، وہ بھی نماز کا ارادہ بلکہ دعا کا ارادہ کر رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے فون اٹھایا۔

ہیلو؟

منوچہر آفتاب۔

اس کے جسم پر جیسے رعشہ سا طاری ہو گیا۔

اس نے رکوع میں جاتی خالہ جان اور جائے نماز بچھاتی ماں کو دیکھا بہت آہستگی سے بولی۔

ہولڈ پلیز۔ ریسیور رکھ کر پاپا کے کمرے میں بھاگ گئی ایکس ٹینشن اٹھایا۔

ہیلو اس نے اپنی آواز کی لرزش پر قابو پا کر کہا خوف اور خوشی سے برا حال تھا۔

خیریت تو ہے ناں؟ منوچہر کی حواس چھین لینے والی آواز ابھری۔

آپ خیریت کے معنی جانتے ہیں اس کا لہجہ خود بخود شاکی ہو گیا۔

اس قدر حسین و خوش قامت و خوش آواز لڑکی کا نخرہ اس کے جذبات کو تپا گیا۔

میں ایبٹ آباد سے بول رہا ہوں، اپنے آبائی گھر سے، یہاں میرے والد علیل ہیں بہت ایمرجنسی میں آیا ہوں۔

اور فون اتنے دن بعد کیا؟

تم یقین نہیں کرو گی۔ یہاں صورت حال ہی کچھ ایسی تھی کہ۔ مجھے احساس تھا کہ تم مجھے فراڈ۔ یا کھلا دھوکا سمجھ رہی ہو گی۔ کہ تم سے تو مراسم بھی ابتدائی ہوتے، اور میں نے تمہارا اقبال جرم بھی پڑھ لیا۔

اقبال جرم۔ وہ کچھ سمجھی نہیں۔

تم نے وہ خط اسی طرح تو لکھا ہے گویا کسی جرم کی مرتکب ہو رہی ہو۔ یا پھر کسی ایڈیٹر کو صفائی کے مسئلے پر۔

مجھے خط لکھنا نہیں آتا۔ وہ شرمندہ ہو گئی۔

خط خیال کی تحریری شکل ہوتی ہے نا اس کے لیے کوئی علیحدہ سے اہتمام تو نہیں ہوتا۔ میں

پابندی پسند نہیں ہوں۔ سن رہی ہو سارا؟ مجھ پر پابندی نہ لگاؤ، ملنے میں کوئی حرج نہیں ہوتا۔ میں چاہتا ہوں تم مجھے سمجھ جاؤ۔ تاکہ بعد میں تمہارے کسی دل دکھا دینے والے الزام سے مبرا رہوں۔ یہ بہت ضروری ہے سارا فرض کرو اگر تمہارے والدین انکار کر دیں تو تم میری عادات واطوار خاندانی پس منظر سے واقفیت کی بنا پر میرے لیے ان سے ضد کر سکو۔

محض تمہارا حسن پاگل نہیں کر گیا ہے مجھے۔ میں قیافہ شناس ہوں تمہیں ایک نظر میں پڑھ چکا ہوں۔ میں تمہیں کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتا سنا تم نے، میں جب کہوں گا تم مجھے ملو گی شیشے سے بڑھ کر سمجھوں گا۔ میں کراچی جلد آؤں گا۔ اعتبار کرنا سیکھو سارا، ایسے کام نہیں چلتے۔

اسی وقت خالہ جان اندر چلی آئیں۔

سارا۔ بیٹے نماز نہیں پڑھی؟ کیا بہت ضروری فون ہے؟ نماز ہر چیز سے زیادہ اولیت رکھتی ہے۔

اچھا فریدہ خدا حافظ۔ اس نے گھبرا کر فون رکھ دیا رخ موڑ کر بیزاری سے بولی۔

میری سہیلی کا فون تھا خالہ جان۔

ایسے ناوقت فون کیا تھا اس نے، نماز بھی قضا ہو گئی۔ انہیں ملال ہوا۔

ہونہہ۔ ایک یہ ہیں ہر وقت پیچھے پڑی رہتی ہیں۔ سب نے اپنی اپنی قبر میں جانا ہے، بڑی جنتی، بہشتی سمجھتی ہیں خود کو، ہونہہ۔ اسے ان کی آمد بہت کھلی تھی۔ بہت سی گستاخ اور من مانی کرنے والی لڑکیوں کی طرح اس نے بھی سخت الجھن محسوس کی تھی نصیحت پر۔

اسے ایک گونہ سا سکون محسوس ہو رہا تھا۔

کافی دنوں بعد اس نے خوش خوش کاموں میں حصہ لیا۔ امی نے تعجب سے اس کے کھلے کھلے چہرے کو دیکھا مگر بولی کچھ نہیں تھیں۔

اس کے وجود میں گویا تازہ لہو دوڑنے لگا تھا۔ اس کے غیر معمولی حسین چہرے پر خوشی اور طمانیت جھلکنے لگی تھی۔

خالہ جان نے دل ہی دل مین چشم بددور کہہ کر اسے تصور میں اپنی بہو کے روپ میں دیکھا جسے دیکھ دیکھ کر لوگ خدا کو یاد کر رہے ہیں۔ وہ دراصل کراچی آئی ہی اسی لیے تھیں کہ اس کو دیکھ لیں کہ کیسی ہو رہی ہے۔ پرکھ لیں کہ کیا کر رہی ہے؟ ہوش گم کر دینے والا چہرہ بجلی کی طرح چمکتا، قامت گویا سانچے میں ڈھالا گیا ہو۔ اس پر سے اپنے حسن سے حد درجہ لاتعلقی کا انداز بالکل ہی لاابالی سا انداز۔

وہ صورت پر تو بچپن سے ریجھ گئی تھیں۔ اب تو سو جان سے واری صدقے تھیں۔ ڈھونڈنے سے کوئی خامی نظر نہیں آتی تھی سوا لاپروائی کے۔ وہ بھی اس کا بچپنا خیال کر لیا گیا۔ انہوں نے سوچ لیا۔

وہ یہاں سے جاتے ہی میاں سے مشورہ کر کے فوراً رشتے کے لیے خط لکھیں گی۔

امی کل ساتھ والوں کے ہاں بنٹی کی سالگرہ ہے ناں۔ میں آپ کی نیلی ساڑھی باندھ لوں؟ اس وقت اس کے سب سے بڑے حمایتی پاپا بھی تھے۔ اس نے موقع غنیمت جانتے ہو

کھانے کی میز پر ہی مسئلہ چھیڑ دیا۔

کوئی ضرورت نہیں ساڑھی واڑھی باندھنے کی بہت کپڑے ہیں تم انہی میں سے کوئی پہن لینا۔ انہوں نے دوٹوک انداز میں بات کی۔

مجھے پتا تھا پاپا۔ امی یہی کہیں گی۔ اس کا منہ پھول گیا۔

ارے بھئی کیا حرج ہے پہن لینے دو ساڑھی۔ انہوں نے اپنا مخصوص کردار نبھایا۔

ابھی رہنے دیں۔ آپ نے اس کا دماغ اور بھی خراب کر دیا ہے۔ کہہ دیا نہیں پہنتی ساڑھی۔ وہ بگڑ کر بولیں۔

پاپا۔ امی تو سگی امی ہی نہیں لگتیں۔ اس نے شکایتی انداز میں ماں کو دیکھا۔

مارے خفگی کے وہ جلد میز سے اٹھ گئی۔

بھئی تم بھی ناحق اس پر سختی کرتی ہو۔ پاپا کو افسوس ہوا۔

آپ کو کیا پتا ہے میں کیا سوچ کر منع کرتی ہوں، باندھ کر چلی جاگی ساڑھی ہفتے بھر بستر پر پڑی رہے گی۔ میٹھا خون ہے فورا نظر لگ جاتی ہے۔ ساڑھی تو بہت ہی جچتی ہے اس پر۔ وہ بہن کی طرف دیکھتے ہو بولیں۔

سچ آپا جان، کہیں جانا غضب ہو جاتا ہے۔ لوگوں کا بس نہیں چلتا وہیں سے رخصت کرا کر لے جائیں۔ رشتوں کی بوچھاڑ ہے۔ اور ایسے میں فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کون سا رشتہ اچھا ہے اور کون سا نامناسب۔ آپ کو شاید محسوس ہو کہ میں اپنے منہ سے بیٹی کے حسن کی تعریف کر رہی ہوں مگر میں تو کہتی ہوں حسین بیٹی بھی ایک امتحان ہوتی ہے۔

اے ہاں۔ ماشاءاللہ۔ انہوں نے بھی بہن کی تائید کی۔

ہمارے ہاں تم ہی سب سے خوبصورت تھیں۔ بیٹی تم سے زیادہ، بھائی افضل نے مجھے اتے آتے کہا کہ ان کے لڑکے کے سلسلے میں تمہاری را معلوم کروں۔ لو بھلا میرے ہاں لڑکا نہیں ہے کیا؟؟

ساجدہ کا دل خوشی سے دھڑکا۔ بہن نے آخر ان کے مطلب کی بات منہ سے نکال ہی دی۔

آپا جان، ابھی اس کی عمر بھی کیا ہے۔ ابھی تو ہمارا ارادہ بھی نہیں ہے۔ جسے دیکھو رشتہ لیے چلا آتا ہے منع کر دو تو برا مان جاتا ہے۔

اب کوئی کہے تو کہہ دینا کہ بھئی کر دیا ہے ہم نے اس کا رشتہ۔ آپا جان نے مشورہ دیا۔ انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ ساجدہ ان کے ہاں رشتہ کرنے پر رضامند ہیں۔ لہذا انہوں نے بہنوئی کو بطور خاص سنانے کے لئے یہ مشورہ دیا تھا۔

تاکہ بہنوئی کے تاثرات بھی جان لیں جو واش بیسن کے سامنے کھڑے ہاتھ دھو رہے تھے۔ بھول گئیں کہ انہوں نے اس سلسلے میں میاں سے مشورہ کرنے کا پروگرام بنایا تھا اور اب اپنے طور پر ہی بات نکال بیٹھی ہیں۔

نثار صاحب تو ویسے ہی ان کے گھرانے کو پسند کرتے تھے ظاہر ہے اچھے ہی تاثرات

دیے۔ بات کھلی بھی نہیں اور ڈھکی بھی نہیں رہی۔

فریقین اپنے طور پر مطمئن ہو چکے تھے۔

وہ بیجرا اپنے کمرے میں اوندھی لیٹی اس کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ ایسا شخص اس کی زندگی میں دوبارہ نہیں آ سکتا۔ وہ اسے نہیں گنوا گی

ملیں جب ان سے تو مبہم سی گفتگو کرنا

پھر اپنے آپ سے سو سو وضاحتیں کر لی

وہ کالج سے نکلی تو پہلے دن کے چور کی سی کیفیت ہو گئی۔

وہ عین گیٹ کے نزدیک تھا اس نے پایہ استقامت کی لرزش قابو کی اور نظر انداز کرتی ہوئی پوائنٹ کی سمت بڑھ گئی۔

میں فلرٹ و محض رومان پسند لڑکی نہیں ہوں۔

میں نے اپنے شریک سفر کو بالکل ایسا ہی دیکھنا چاہا ہے۔

اسے میرا محبوب نہیں شریک سفر بن جانا چاہیے۔ نسلوں کا اکتساب لہو بن کر اس کے جسم میں دوڑنے لگا۔

پوائنٹ خالی تھا وہ کھڑکی کے نزدیک والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ چور نگاہوں سے باہر کی سمت دھا اس کی موٹر حرکت میں آ گئی تھی۔ اس کے اندر کچھ ہونے لگا۔

اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ افسوس کرنے لگی۔ اتنے دنوں بعد تو آیا تھا۔ جس کے لیے وہ بیجل ماہی بنی رہی تھی۔ آخر اس نے یہ حرکت کیوں کی اسے آزمانے کو؟

آخر میرا تماشا بھی تو بن سکتا ہے۔

مم۔ میں دراصل اس سے ڈرتی ہوں۔ اس کے سامنے اس کی کسی بات سے انکار کا حوصلہ نہیں ہوتا خدا معلوم کیا کہہ دیتا اور میں مان لیتی۔

منوچہر۔ میں تو فون پر منتظر رہی کہ آپ خوش خبری سنائیں گے۔

اس نے خود کو بہلایا۔ موٹر نظروں سے اوجھل ہو گئی دل پر جیسے منوں بوجھ آ پڑا تھا۔ کہیں وہ ناراض نہ ہو گئے ہوں۔ عظیم الشان آدمی۔ جیسے کوئی لارڈ۔ نہیں جیسے کوئی ڈیوک ان کے ساتھ یہ حرکت زیب نہیں دیتی۔ سینکڑوں ہزاروں لڑکیاں ہوتی ہیں یہاں۔ اور وہ صرف میری خاطر۔

اس شام سے رات تک اس نے فون کی باریک سی گھنٹی کا انتظار کیا۔

پھر اس کے بعد اس نے موٹر بھی نہیں دیکھی۔

اس کا فون بھی نہیں آیا۔

کوئی خط بھی نہیں آیا۔

پورے ہفتے بھر وہ خود کو کوستی رہی یہ اس نے کیا کر دیا کھو دیا اسے؟

نہیں۔

بلکہ وہ کھل گیا۔ یقیناً اس نے مجھے بیوقوف بنانے کی کوشش کی تھی۔ چلو اچھا ہوا۔ مگر۔ وہ ا

اللہ کیا کروں؟

خط لکھ دیتی ہوں۔ دیر تو نہیں ہوئی۔ وہ کھو نہ جا اس نے کاغذ قلم سنبھالا۔

پھر رکھ دیا۔

اس میں انا نہیں جاگی تھی۔

وہ شاید اس کی سچائی جاننے کے لیے خود ہی بضد ہو گئی تھی۔

ہفتے کی سہ پہر جب وہ گھر میں داخل ہوئی تو امی نے زرد رنگ کا لفافہ اسے تھمایا۔

اس کا دل دھڑک اٹھا۔ اس نے ماں کی جانب دیکھا واپس پلٹ گئی تھیں۔ لفافہ بند تھا۔

اس نے بے تابی سے چاک کیا۔

پرنس

خوش رہو

غلطی انسان ہی سے ہوتی ہے ناں۔ مجھ سے بھی ہو گئی اگر تم میری طلب سے میل کھاتی ہو تو یہ بھی میری غلطی ہے۔ سارا واقعتاً راہ چلتوں پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن یہ بھی بتاؤ اگر پیاسے مسافر کو راہ میں کنواں مل جا تو اسے کیا کرنا چاہیے؟

میں تمہیں معصوم سمجھا تھا تم تو پتھر ہو۔

ایک ہفتے تک ذہنی عذاب بھگتنے کے بعد تم سے آخری بار مخاطب ہو رہا ہوں۔ یہ میرا مقام نہیں تھا۔ تم مجھے کہاں پہنچا ای۔ میں نے لڑکی پہلی مرتبہ نہیں دیکھی تھی۔ سچ تو یہ ہے ایسی نہیں دیکھی تھی۔ حقیقت میں جس کا پلہ بھاری ہوا سے موقع سے فائدہ ضرور اٹھانا چاہیے۔

تم فائدہ اٹھاؤ، میں ملال سہتا ہوں۔ دنیا میں بہت سے واقعات ہوتے ہیں جو قوت برداشت کا امتحان ہوتے ہیں۔ پھر بھی لوگ زندہ رہتے ہیں۔ میں بھی کوشش کروں گا۔ برا مہربانی خط، فون وغیرہ کی تکلیف نہ کرنا۔

منوچہر آفتاب

اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں دبا دیا۔

یہ کیا ہو گیا؟۔

یہ میں نے کیا کر دیا۔ کیا اب مجھے وہ زندگی، وہ محبت وہ مقام مل سکے گا جو اس کی ذات کے حوالے ملتا۔؟

سب سے بڑھ کر۔ اس قدر شدید محبت۔

میں نے اس کی قوت برداشت کا امتحان لے کر بہت بڑی غلطی کی۔ اپنی خوش بختی پر خود ہی روک لگا دی تھی۔

اسے کسی کل چین نہیں پڑ رہا تھا۔

رات کو وہ پاپا کے کمرے کا ایکس ٹینشن پلگ کال آئی تھی۔ خالہ اور امی ساری رام کہانیاں سنا کر سو گئیں تو اس نے تین عددی نمبر ڈائل کیا۔

کچھ دیر گھنٹی بجتی رہی پھر کسی نے فون اٹھایا۔

ہیلو۔ ڈبل فور زیرو۔

وہی تھا۔ اس نے خشک گلے کھنکھار کر کہا۔

سارا بول رہی ہوں۔

فون فورا رکھ دیا گیا۔ احساس توہین۔ ملال اور شاید محبت۔ وہ کھڑی ہونٹ چباتی رہی۔ دو آنسو اس کے رخساروں پر لڑھک آئے تھے کہ یہ عمیق اور گہرے جذبے حساس لوگوں کے جی کا ہی تو آزار ہوتے ہیں۔ لڑکی حساس ترین ہو۔ آگاہ ہو وہ رومان پسند و جذباتی ہو تو جنگل کی آگ کی طرح شدت سے بھڑکتی ہے کہ گندم کا خمیازہ میزان کے دن تک جاری ہے۔

جذباتیت بیوقوفی کا زینہ ہے۔

اس نے سمندر نہیں بہا۔ پھر نمبر ڈائل کیا۔

گھنٹی بجتی رہی۔ آخر کار فون اٹھالیا گیا۔

پلیز، میری بات تو سن لیں۔

آدھی رات کو شعلوں کو ہوا نہ دو سارا میں ذہنی سکون کے لئے سونا چاہتا ہوں۔ مجھے اس وقت تمہاری طلب ہے۔ میرا امتحان ہے تو تمہارا بھی امتحان ہے۔

کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ وہ گھبرا کر بولی۔

کیوں فون کیا ہے؟ یہ کام تو بااختیار کرتے ہیں۔ تمہیں نہ اعتبار کرنا آتا ہے نہ محبت۔ بزدل محروم رہتا ہے۔

سارا۔

شادی بیاہ کھیل تو نہیں ہوتا۔ وقت تو لگتا ہے ناں۔

تو آپ خوشی خوشی انتظار کر لیں ناراض کیوں ہوتے ہیں؟

تم کم عمر ہو بہت سی باریکیوں سے ناواقف۔ کل شام تم مجھے ضرور ملو نہیں تو۔

و۔۔ وہ مگر۔

شیزان میں، خدا حافظ۔

کبھی بھی نہیں منوچہر کبھی بھی نہیں۔ وہ خود سے گویا ہوئی تھی۔

اس کے انداز میں استقامت تھی۔ اس نے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔

☆

یہ تبسم، یہ تازگی، یہ نکھار
زندگی کس سے بات کر کے آئی ہے؟

اس نے دھڑکتے دل سے شیشے کے دروازے پر ہاتھ رکھا۔ وہ کھڑکی کے پاس تنہا بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔

اس نے پرس اور فائل سینے سے لگا رکھی تھی۔ ڈارک براؤن تھری پیس سوٹ میں وہ اتنا باوقار اتنا شاندار لگا کہ وہ ایک لمحے کو خود پر نازاں سی ہو گئی۔

وہ میز کے سامنے آ نکی۔

آداب

اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ ایک خوش امید رنگ لے آئی تھی۔

تسلیم جناب۔ اگر آپ یہ رنگ نہ دکھائیں تو روایت کیونکر پوری ہو۔ اس کیا انداز مین شکوہ تھا۔

وہ بیٹھ گئی۔

میں ضروری کام سے کراچی آیا تھا۔ تقریباً ایک ماہ کے بعد پھر ایبٹ آباد جا رہا ہوں۔ کہنا یہ ہے کہ خط لکھوں گا، جواب آ گا ناں؟

اس کا سر جھکا رہا۔

اس مرتبہ میں گھر والوں سے ضرور بات کروں گا۔ تم بے فکر رہنا۔ کم از کم تم اعتبار تو کرو گی ناں؟

کیا منگاؤں؟

کچھ نہیں۔ اس کے لب ہلے۔

ایسا تو خیر نہیں ہو سکتا نہ مہمان ہو میری۔ ہاں اب آئندہ انشا اللہ ہم آپ کے مہمان ہوں گے۔ اور آپ کی میزبانی سے حظ اٹھائیں گے۔ وہ بڑے انداز سے بولا۔

اس نے ویٹر سے کولڈ ڈرنکس اور اسنیکس لانے کو کہا۔ وہ سب ڈر اور خوف بھول گئی۔ چند ماہ بعد یقیناً وہ اس کی ہو گی۔ بعض لوگ سراپا یقین ہوتے ہیں اس نے جو نظروں سے منوچہر کو دیکھا۔

منوچہر اس کے حسین چہرے پر نظریں جما جانے کیا دیکھ رہا تھا۔

وہ واقعتاً بے پناہ حسین تھی۔ اس کا ایک ایک نقش بولتا تھا۔ میزوں پر بیٹھے ہو مرد حضرات اس کی جانب گاہے بگاہے ضرور دیکھ لیتے تھے۔

شانوں پر سفید دوپٹہ بے پروائی سے پڑا ہوا تھا۔ دوپٹے سے چھلکتا اس کا وجود اسے ایسی چھو بنا رہا تھا۔ جسے اٹھا کر لے بھاگنے کو جی چاہتا ہے۔

وہ اس کے بہت نزدیک تھی مگر پھر بھی بہت دور تھی۔ وہ ابھی اس کے کہے میں نہیں تھی۔ بہت سی آمادگیوں کے کالے کوس منوچہر کو پاپیادہ طے کرنا تھے اس نے آج اس حسین کتاب کا ایک صفحہ اور پڑھنا تھا۔

لوگ اس کی جانب متوجہ تھے۔ اور وہ سوچ رہی تھی۔

بلاشبہ یہ منوچہر ہی ہی ایسی چیز جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس نے بہت یقین اور وعدوں کے وزن اٹھا اور کھڑی ہو گئی تھی۔

اب میں چلوں گی بہت دیر ہو گئی ہے۔ اس نے گلاس آہستہ سے رکھا۔

ہاں۔ کچھ مہینوں کے اضطراب ابھی میرا مقدر ہیں۔ وہ گلاس ہاتھ میں تھامے شکستگی سے بولا۔ میں ڈراپ کردوں گا تمہیں۔ اس کی تشنہ نظریں اس کے سراپے پر دوڑنے لگیں۔

نہیں نہیں۔ بہت دیر ہوگئی۔ سمیع یا پاپا تو روڈ پر آ کھڑے ہو ہوں گے۔ وہ گھبرا کر بولی۔

خط کا جواب تو دوگی ناں؟

آئی ول ریپلائی پرائڈڈ ڈیٹ یو واک آن دی رائٹ۔

بیرا اسے اٹھتے دیکھ کر قریب آ کھڑا ہوا تھا لہٰذا وہ انگریزی میں بولی۔

اب تم بزرگوں کی طرح نصیحت مت کرو۔ میں اپنے طور پر بالکل صحیح راستے پر چل رہا ہوں۔ جو راستہ بھی تمہاری طرف جاتا ہے۔ صحیح ہے۔

وہ اسے والہانہ دیکھتے ہو بولا۔

لیٹس گو۔ وہ چابیاں اٹھاتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ بل مع ٹپ خوبصورت سی پلیٹ میں رکھا۔

نہیں نہیں۔ میں ے کہا ناں۔ آئی ول گو الون۔

اتنی محتاط رہوگی تو مجھے خدشہ ہے مجھے محروم ہی رکھوگی۔

کیا؟ وہ حیرانی سے بولی۔

کچھ نہیں۔ وہ بڑے گریس سے مسکرایا۔

دونوں آگے پیچھے باہر نکل آ۔ وہ یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئی کہ اس کی مطلوبہ بس سامنے ہی کھڑی تھی۔

وہ خدا حافظ کہہ کر بس کی سمت تیزی سے بڑھی تھی۔

وہ ایک گھنٹہ لیٹ تھی۔ سارا گھر پریشان تھا۔

وہ سب کو اپنا منتظر دیکھ کر گھبرا گئی تھی۔

ایگزیم نزدیک ہیں ناں۔ جو پریکٹیکل مس ہوگئے تھے ان کو کرنے میں دیر ہوگئی۔ اس نے ماں کی پریشان اور متجسس نظروں کا فوری جواب دیا۔

اگر ایسی بات تھی تو کہہ کر جاتیں۔ امی نے مخصوص سنجیدہ انداز میں کہا۔

آئندہ بتا کر جاؤں گی۔ یاد نہیں رہا تھا۔

سامنے سے خالہ جان کو آتا دیکھ کر وہ جلدی سے کہہ کر آگے بڑھ گئی۔ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے مگر اندر بہت ہی شور مچاتا ہے۔

اسے ایسا محسوس ہوا کہ اگر کچھ دیر اور کھڑی رہی تو یہ سب حقیقت کھوج لیں گے۔ سب لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہوگئے تو وہ بھی مگن ہوگئی اس کے تصور میں۔ اپنا اچھا سوچنا سب کا حق ہے۔ جو چیز میں نے پائی ہے۔ اس کا کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اس نے پھر اپنا فیصلہ دہرایا۔ وہ اسے نہیں گنوا گی۔

شب بھر تھا انتظار کہ پھوٹے گی روشنی

جاگے تو روشنی کو اندھیرے نگل گئے
شیشہ گروں کے شہر میں گزری تمام عمر
پھر بھی یہ پوچھتے ہو کیوں کر پگھل گئے

خالہ جان واپس ہو چکی تھیں۔ اور جاتے ہی دھما کا بھی کر دیا تھا۔ یعنی باقاعدہ رشتہ مانگ لیا تھا۔ گذر بھر کو خوشی تھی، نہایت ہی مناسب رشتہ تھا۔

امی نے تو خوشی سے بیقابو ہو کر اپنی چہیتی اور بوڑھی پڑوسن کے سامنے تذکرہ بھی کر دیا۔

اماں۔ رشتہ بالکل میری مرضی کے مطابق ہے۔ سگی بہن ہے میری، ایک ہی بیٹا ہے۔ یہ تو ویسے بھی تنہائی پسند ہے۔ کوئی نہیں گھر بھر میں۔ ماں باپ اور بیٹا وہی مثل ہے کہ ایک میں میرا مونس تیسرے کا منہ جھلے۔ عیش کرے گی عیش۔

اس کی خالہ کا گھر گویا میکا بھی سسرال بھی۔

خیر دلہ یہ تو نہ کہو، ساس نام کی خالہ اس کا بھی منہ کالا۔ ساس کا تو رشتہ ہی اور ہوتا ہے۔ دعا کرنی چاہیے کہ بٹیا سکھی رہے۔ جو تم سوچ رہی ہو وہی ہو۔ اللہ تمہیں اولاد کی خوشیاں نصیب کرے۔

وہ واش بیسن کے پاس کھڑی ہاتھ دھو رہی تھی۔ اس کے تو گویا پاؤں تلے سے زمین سرک گئی تھی۔ وہ خواہ مخواہ ہاتھ مسل کر جھاگ بنانے لگی۔

یہ۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ اوہ میرے خدا میں تو مر جاؤں گی۔ اس کا دل جیسے بیٹھنے لگا۔ آخر کر گئیں بڑی بی اپنا کام۔ ہر وقت نظروں سے تولتی رہتی تھیں۔ تو یہ وجہ تھی؟ اتنی دور بیاہنے آئیں گی۔ کیا لاہور میں لڑکیاں نہیں ہیں؟ اسے خالہ سے نفرت سی محسوس ہوئی۔ گویا اس سارے کیے دھرے کی قصوروار صرف وہی ہوں میں یہ سب کچھ کبھی نہیں ہونے دوں گی، اس نے مصمم ارادہ کر لیا۔ ہر شے سے ٹکرانے کا۔

رات کو اس نے تفصیل سے منوچہر آفتاب کو ہر بات لکھی۔ اور اس کے جلدی آنے پر اصرار کیا۔ منوچہر کا تشویش بھرا جوابی خط فوراً آ گیا تھا۔ اس نے منصور کے بارے میں کچھ باتیں پوچھی تھیں اور اس کا ایڈریس بھی معلوم کیا تھا۔

اس نے فوراً ہر بات لکھ بھیجی جو منوچہر نے معلوم کرنا چاہی تھی۔

اور اس خط کے جواب میں منوچہر خود آ گیا تھا۔ اور آتے ہی شام کو فون پر اطلاع دی تھی۔ اور اسے اپنے گھر آنے کو کہا تھا کہ وہ چند اہم باتیں کرنا چاہتا ہے۔ وہ تو ان دنوں بالکل بدحواس تھی۔ ہر وقت یہ کھٹکا تھا کہ کچھ ہو نہ جا۔ اسی سلسلے میں آج وہ منوچہر کے حشمت کدے میں نظریں جھکا بیٹھی تھی۔ نوکر نے اسے بتایا کہ صاحب غسل فرما رہے ہیں۔

وہ انتظار کی کوفت کا ذائقہ چکھنے لگی۔ کئی بار کی ملاقاتوں نے اسے بیپناہ اعتماد بخشا تھا۔ آج وہ ذہنی طور پر اتنی آزاد اور ہلکی پھلکی تھی کہ کاؤچ پر لیٹ کر ورق گردانی بھی کر سکتی تھی۔ وہ گھاگ اور شاطر تیز و طرار لڑکی نہیں تھی اور انسانوں کی سمجھ تو اسے ویسے بھی نہیں تھی۔

عموماً پارٹیز سے واپسی پر وہ ماں سے کہتی۔

امی۔ وہ جو صفیہ آنٹی کی کزن تھی ناں۔ اللہ ریڈ ساڑھی میں کیا غضب ڈھا رہی تھیں۔

ہاں مگر خدا محفوظ ہی رکھے۔ بہت تیکھی لگتی تھی ناکوں چنے چبوا دیتی ہیں ایسی لڑکیاں۔

اور جب وہ ایک چھوٹی سی بچی تھی اور سامنے والے کریانہ اسٹور سے چیونگم، ٹافیاں لالی پاپ وغیرہ خریدا کرتی تھی۔ ایک شام بازار سے واپسی پر وہ ماں کے ساتھ ہی ٹافیاں خریدنے اسی مخصوص اسٹور میں گھس گئی تھی۔

گھر آ کر امی نے کہا تھا۔

سارا بیٹے۔ تم آئندہ اس اسٹور پر تنہا نہیں جاؤ گی۔

کیوں امی؟

زمانہ بہت خراب ہے۔ وہ بڑبڑائی تھیں۔ اپنے پاپا سے کہہ دیا کرو جو چیز بھی تمہیں چاہیے۔ شام کو واپسی پر لا دیا کریں گے۔

اس وقت اس کا ننھا سا ذہن سوچوں میں گھر کر رہ گیا تھا۔ آج اسے یونہی ماں کی بات یاد آ گئی تھی۔ امی کہا کرتی تھیں۔

آبرو عورت ہی کی نہیں مرد کی بھی ہوتی ہے۔ بیحد آبرومند ہوتا ہے وہ مرد جو عورت کی کمزوری سے فائدہ نہیں اٹھاتا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی ماں بیحد عقل مند عورت ہے اسے انسانوں کی سمجھ ہے لیکن۔ امی نے بہت سے لوگ دیکھے ہیں منوچہر کو تو نہیں دیکھا۔ امی ابھی ادھوری ہیں۔ اس نے عظیم الشان ڈرائینگ روم میں نظریں گھمائیں۔

کشادہ حصے سے منوچہر برآمد ہوا۔ ہیلو۔

وہ ریچھ کی کھال جیسے سیاہ باتھ گاؤن میں تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوتے۔

وہ اس بے تکلف انداز میں بھی بیحد دلکش لگا۔ شیشے کی طرح چمکتا، دمکتا نفیس مرد اس نے پائپ میں تمباکو بھرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کا جواب سنے بغیر۔

آپ کبھی تمباکو۔۔۔ میرا مطلب ہے کبھی پائپ پیتے ہیں۔ اور کبھی سگریٹ۔

اس نے کچھ بھی بولنے کے بہانے گویا یہ جملے کہے تھے۔ جملوں میں نزاکت اور اپنائیت شفاف محسوس کی جا سکتی تھی۔ جیسے وہ در و دیوار ہی پر جتا رہی ہو کہ یہ جو عالیشان مرد ہے ناں۔ میرا ہے۔ پاگل ہے میرے لیے۔

ہاں۔ بس ایسے ہی ذائقہ بدلنے کے لیے یا پھر یہ بھی کہہ سکتی ہو کہ مختلف ذہنی کیفیات کے مختلف انداز ہیں۔

سارا۔ تم نے مائنڈ نہیں کیا ناں کہ میں نے تمہیں یہاں بلایا۔ بات یہ ہے کہ میں تمہاری احتیاط اور گفتگو سے اندازہ کر چکا ہوں کہ تم بہت مہنگی ہو۔

جی؟ وہ چونک اٹھی۔

کیا یہ میرے دام لگا رہا ہے۔ اسے یہ جملہ انتہائی ناگوار گزرا۔

میرا مطلب ہے۔ معاشرتی طور پر لوگ اپنے بھرم اور عزت کا ایک پیمانہ بنا لیتے ہیں۔ ایک طبقے کی جس بات سے ناک کٹتی ہے دوسرا اسے روشن خیالی کا نام دیتا ہے۔ میرا مقصد یہی

ہے کہ تمہارے ہاں شاید پابندیاں، بھرم اور عزت کا تحفظ سمجھی جاتی ہیں۔

خیر۔ میرا مطلب یہ ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تم مشکل میں پڑ جاؤ۔ کیا جواب دیا تم نے والدین کو۔

ابھی تو کچھ نہیں۔ انہوں نے ابھی مجھ سے پوچھا بھی نہیں اور شاید پوچھیں بھی نہیں۔ امی تو مجھے بیحد نا سمجھ سمجھتی ہیں۔ وہ اس کی سمت دیکھے بنا بولی۔

یہ کیا بات ہوئی؟ پھر تم انکار کیسے کرو گی؟

آپ کے گھر والے آئیں گے تبھی کچھ کر سکوں گی۔

چاہے اس اثناء میں کچھ ہو جا۔

خدا نہ کرے۔ اس کی نظریں بدستور نیچی تھیں۔ اتنی ملاقاتوں کے بعد وہ اس پر اندھا یقین رکھتی تھی۔ ڈر تو قطعی محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ خواہ مخواہ ہی بس سانسیں اتھل پتھل ہو جاتی تھیں۔

میں نے بات کر لی ہے، انہیں کوئی اعتراض نہیں ذات پات کا کوئی مسئلہ نہیں اونچائی نیچائی کی کوئی بات نہیں۔ تم میری پسند ہو۔ ان کے لیے یہی بہت ہے۔ میں تمہیں البم دکھاتا ہوں۔ ٹھہرو۔

وہ سامنے کارنس کی سمت سے ایک سیاہ البم اٹھا لایا۔

اسی دم نوکر بھی ٹرالی لیے چلا آیا۔

چا بناؤ ثنارا۔

کتنا اچھا لگتا ہے اس کا یہ بے تکلف انداز۔ وہ جانتا تھا وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہے تو وہ ساری جان سے کانپ جاتی ہے۔ جب وہ نظریں جھکاتی تو وہ سیر ہو کر دیکھتا۔

وہ چا بنانے لگی۔ پلکوں کی جھالریں رخساروں پر سایہ فگن ہو گئیں۔

مرد کی محبت پاش نظریں تو سورج کی حدت کی طرح سے محسوس ہوتی ہیں۔ نظریں جھکی ہوئی تھیں جذبے تو روشن تھے۔ اس کا جی چاہا کہے میں اس وقت اکیلی ہوں گھر میں مجھے مت ہولاؤ۔ مت دیکھو ایسے۔

چا اس کی سمت بڑھائی۔ اس نے چا تھام لی اور اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔ پھر ایک دم یوں اچھلی گویا بچھو نے ڈنک مار دیا ہے۔

اوں ہوں بیٹھو بھئی۔ کیا ابھی تک اتنا اختیار نہیں کہ تمہارے نزدیک بیٹھ سکوں؟ میں دراصل یہ البم دکھانا چاہتا ہوں تمہیں۔ یوں سمجھو تعارف کرا رہا ہوں فیملی ممبرز کا سٹ ڈاؤن سارا۔ اس نے ثنارا کا دودھیا بازو تھام کر بٹھا لیا۔ اور سارا تو جیسے طوفانوں کی زد میں آ گئی۔ وہ کانپ کر بیٹھ گئی۔

منوچہر نے البم کھولا۔ پہلے صفحے پر اس کی خود کی بڑی خوبصورت سی تصویر تھی۔ پھر اس نے ایک تصویر کی جانب اشارہ کیا کہ یہ میرے والدین ہیں۔

وہ تصویروں کی جانب ہمہ تن متوجہ تھی اس کی قربت سے وہ بے پناہ سٹپٹا رہی تھی۔

وہ ہاف آستین شرٹ میں تھی اس کے صحت مند اور دودھیا بازوؤں سے منوچہر کا نائٹ گاؤن ٹچ ہو رہا تھا۔ سگریٹ اور کولون کی مکس خوشبو سے مہکتی سانسیں۔ وہ بہت گھبرا رہی تھی اور خود کو بے بس بھی محسوس کر رہی تھی۔

سارا۔ اس کے کان کے پاس سے آواز ابھر کر اس کے بچے کچھے حواس چھین کر لے جانے لگی۔

سارا۔ بعض لوگ اپنی آرزوؤں کے معاملے میں ضدی ہوتے ہیں۔ اپنے معیار سے کم کسی چیز پر راضی نہیں ہوتے۔

پتا نہیں۔ وہ دل ہی دل میں بولی۔

ایسے لوگوں کے ان کے معیار کے مطابق چیز کا نہ ملنا ہی بہتر، نہ کہ ایسی چیز ملے جو ان کو مطمئن نہ کر سکے۔ جس چیز سے معیار کی تسکین نہ ہو وہ چیز طلب اور بھڑکا دیتی ہے۔ میرے ساتھ بھی دیکھو یہ کیسا مذاق ہوا تھا۔ یہ دیکھو۔ اس نے ایک تصویر پر انگلی رکھی۔

کس کے بندھی ہوئی چوٹی ناک میں پڑی موٹی سی لونگ اور بڑے بڑے بالے بھدی سی ناک بغیر تراشہ کے موٹے موٹے ہونٹ

یہ میری ماں کی چہیتی بہن کی اکلوتی بیٹی ہے۔ یہ لوگ زمیندار ہیں اس کی ماں نے مرتے وقت میری ماں سے وعدہ لیا کہ اس کی شادی میرے ساتھ کر دی جا۔

کیا یہ میرے قابل ہے؟ قطعی نہیں۔ جب مرد پہلی بار اپنی بیوی کا گھونگھٹ اٹھاتا ہے تو وہ بارود بھری بندوق ہوتا ہے میں پہلی شب سے آج تک بھڑک رہا ہوں۔

وہ اس کی متغیر کیفیت سے قطعی غافل روانی اور بیباکی سے کہہ رہا تھا۔ اس کی عمر اور شادی شدہ حیثیت کے بالکل مطابق اس کی گفتگو بلکہ طرز گفتگو تھی۔ ایک تو اس پر اس انکشاف کا پہاڑ ٹوٹا تھا۔ دوئم اس کی حالت غیر ہو گئی۔ روشنی کے جھماکے کے ساتھ جیسے شعور کی وہ آنکھیں اس کے سر کے پیچھے لگ گئیں۔ جن سے وہ گزرگاہ پر نقش رفتہ دیکھنے لگی۔ مشاہدے سے لوگ سبق سیکھنے لگ جاتے تو تجربہ نام ہی مٹ جاتا۔

ہر شخص اپنی جنت اپنا جہنم اپنی بغل میں دابے پھرتا ہے۔

تم کہو گی کہ آخر شادی سے پہلے بھی تو میں نے اسے دیکھا ہوگا؟

میری والدہ کا گھرانہ بیحد قدامت پرست تھا۔ وہ بیحد خوبصورت ہیں۔ اور اس سے کہیں زیادہ سادہ۔ یہ محترمہ اور دوسرے لوگوں کی طرح پردہ کرتی تھیں۔ بہت سخت پردہ، میں تعلیم کی وجہ سے بچپن ہی سے ہاسٹلز میں رہا ہوں عزیز رشتہ داروں سے میرا کوئی لنک نہیں رہا۔ میں ایک تصور پرست اور بیحد حسن پرست ہوں۔ تم ہی کہو کیا یہ میرے ساتھ مذاق نہیں ہے؟ میں اسے خود سے دور ہی رکھتا ہوں۔ مجھے تنہا رہنا گوارا ہے لیکن۔

منوچہر نے اپنا بازو اس کی گردن کے پیچھے پھیلا لیا۔ وہ آگے کو کھسک گئی۔

اس کی قوت گویائی جیسے سلب ہو کر رہ گئی تھی۔

شاید میری خالہ نے اپنی بیٹی کو جان کر سختی سے پردہ کرایا۔ آخر جاتے جاتے کام دکھا گئیں۔

نا۔ مجھے بدصورتی سے چڑ ہے۔ میں پہلے مقابل میں حسن تلاش کرتا ہوں۔ اس کی صورت میں نہ سہی آواز میں بولنے کے انداز میں، جامہ زیبی میں، ذہن میں کہیں نہ کہیں سے حسن کھوج لیتا ہوں۔ تب ہی مقابل سے اطمینان سے بات کر سکتا ہوں۔ ورنہ ذہنی خلفشار میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔ اور میری بیوی۔۔۔ بیوی کے اخفاء حسن پر میں یقین نہیں رکھتا۔ اسے خوبصورت نظر بھی آنا چاہیے۔

کاش میری ماں اتنی سادہ نہ ہوتی۔ وہ تو اتنی خوش تھیں۔ وہی قدامت پسند سوچ کہ رشتہ گھر میں مل رہا ہے۔ میں ان دنوں ہیوسٹن میں تھا۔ جب مجھے شادی کا، اپنی شادی کا بلاوا بھیجا گیا۔

قدامت پرستوں کے ہاں جانے انٹلیکچوئل بچے ہوتے ہی کیوں ہیں؟

وہ بول رہا تھا وہ پتھر بنی ہوئی تھی۔

سارا۔ وہ اسے ساکت دیکھ کر گھبرا گیا۔

آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ اسے اپنی آواز اجنبی سی لگی۔

یہ باتیں گھر میں بیٹھ کر بتانے کی تھیں۔ فون پر اتنی لمبی چوڑی بات کیسے کرتا۔ خط لکھتا تو ایک رم وضاحتوں کا لکھنا پڑتا۔ روبرو بیٹھ کر بات آسان ہو جاتی ہے۔

سارا۔ دو سال کنوئینز کے پاس رہ کر پیاسا رہا ہوں۔ تم میرا آئیڈیل ہو، میں تمہیں ہر قیمت پر پانا چاہتا ہوں، خواہ مجھے کوئی انتہائی قدم اٹھانا پڑے۔

وہ بری طرح چونک گئی اور جھٹکے سے کھڑی ہو گئی۔ اسے منوچہر سے ڈر لگنے لگا تھا۔ منوچہر نے اس کا مومی ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ اس نے مزاحمت کرنی چاہی۔

بیٹھو سارا۔ یہ صورت حال بھی متوقع تھی۔ اگر میں تم سے یہ بات چھپا لیتا۔ اس نے لپ اسٹک سے عاری عنابی اور بھیگے بھیگے ہونٹ کانپ رہے تھے۔

منوچہر بھی کھڑا ہو گا۔ اور اپنے مضبوط ہاتھوں کا دباؤ اس کے کندھے پر ڈال کر زبردستی بٹھایا۔

اس نے سرد سے انداز میں اس کے ہاتھ اپنے شانوں سے ہٹا۔

سارا آؤ۔ میرے بیڈ روم میں آؤ وہ جو اس دن میں ن تم سے تمہاری تصویر کا نیگیٹو لیا تھا۔ آؤ دکھاؤں اس کا کیا کیا ہے میں نے۔

وہ اپنا ڈر اور خوف ظاہر کرنا نہیں چاہ رہی تھی۔ اس نے اپنے ذہن میں لائحہ عمل مرتب کر لیا تھا۔ گھر میں نوکروں کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ اس کے دل کو کچھ کچھ ڈھارس تھی۔ وہ اس قدر انجان نہیں تھی کہ اس کی نظروں کے مفاہیم سے واقف نہ ہوتی۔

آپ مجھے یہیں دکھا دیجیے۔ اس نے خود کو پرسکون کر لیا۔

منوچہر نے چونک کر اس کا چہرہ دیکھا۔ اسے آزادی اور من مانی پسند تھی اور حسن ناواقف۔ یقیناً اس سے غلطی سرزد ہو گئی۔ (یہ تو محتاط لگ رہی ہے)۔

اچھا ٹھہرو۔ فضل؟ اس نے نوکر کو آواز دی۔

جی صاحب

میرے بیڈ روم سے، ان کی تصویر اٹھا کر لاؤ۔

فضل چلا گیا پھر جلد ہی ایک بڑا سا فریم اٹھا لایا۔

انتہائی خوبصورت فریم میں سارا کا حسن سواتر ہو کر کلوز اپ کی شکل میں مقید تھا۔

میں اس فریم میں الزبتھ ٹیلر کی ٹرانسپیرسی بھی لگا سکتا تھا۔ لیکن مجھے تو وہی چیز پاس رکھنا پسند ہے۔ جسے میں ہاتھ سے چھو کر محسوس بھی کر لوں۔

سارہ کے حلق میں جیسے کانٹے پڑ گئے تھے۔

مجھے یہ باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ آخر اس نے ناگواری کا اظہار کر ہی دیا۔

پہلی مرتبہ ہر عورت اسی طرح گھبراتی ہے۔ اس کا لہجہ جذبات سے بوجھل تھا۔

ہم جلدی شادی کر لیں گے سارا۔

بیٹھو سارا، پلیز، بیٹھو سارا۔

اس کی خوشبوئیں، اس کی سگریٹ، اس کا گلیمر۔ سیاہ دھواں بن کر آنکھوں کے سامنے ناچنے لگا۔

بیٹھو سارا۔ اُن کا بھاری ہاتھ میں ایک موٹا سا انگارہ بن کر اس کے شانے پر ٹھہر گیا۔

سارا۔ تم نے تو سفر ہی نہیں کیا کبھی، لمبے راستے کے بعد بہت پیاس محسوس ہوتی ہے۔

وہ اس کے جال میں پھڑپھڑاتے ہوئے بھی اوسان بحال رکھے ہوتی۔ کہ وہ ایک بھرپور مرد تھا وہ نازک سی لڑکی۔

منوچہر مجھے سخت پیاس لگی ہے۔ اس نے اپنی آواز پر قابو پا کر کہا۔

فضل، پانی لاؤ۔ پانی کے ذکر کے ساتھ ہی جیسے اس پر بھی چھینٹے پڑ گئے تھے۔ وہ کاؤچ سے سر ٹکا کر بیٹھ گیا تھا۔

فضل پانی لے کر آیا۔ اس نے گلاس تھامنے کے ساتھ ہی فورا کہا۔

فضل۔ اس وقت کوئی رکشہ مل جاگا؟

دن کا ڈیڑھ بجا ہے بی بی۔ بہت رکشہ مل جائیں گے۔

اچھا میں چلتی ہوں بہت دیر ہوگئی ہے۔

میں چھوڑ آؤں گا تمہیں۔ وہ آہستگی سے یا شکستگی سے بولا۔

نہیں نہیں، آپ کو تیاری میں دیر لگ جاگی۔ میں فضل کے ساتھ چلی جاتی ہوں۔ اس نے جلدی جلدی گلاس چڑھایا اور تیزی سے باہر نکل آئی۔ باہر آ کر ایسا محسوس ہوا گویا کسی تہ خانے سے باہر آئی ہو۔

وہاں تک اس نے خود کو بہت سنبھالا ہوا تھا مگر رکشے میں بیٹھتے ہی جیسے وہ بھربھری مٹی کی طرح ڈھے گئی۔

بڑی مشکل سے خوف وندامت کے لمحوں میں ذخیرہ کیے ہوا شکوں کو روکا ایک قیامت تھی

جو گزرنے والی تھی۔ اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر۔

بھرم ٹوٹنے کی کیفیت وہی سمجھ سکتا ہے۔ جس کا کبھی بھرم ٹوٹا ہو۔

بعض چیزیں سن کر محسوس ہوتی ہیں۔ اور بعض بھگت کر اس کا بایاں بازو اب بھی سلگ رہا تھا۔

ملال دو تھے۔ اول یہ کہ وہ کتنی سطحی لڑکی ہے۔ ظاہری چمک دمک سے کسی قدر مرعوب ہو جاتی ہے۔ دوئم۔ اس نے اپنے والدین کے ساتھ سخت زیادتی کی۔ ان کی اجلی و مصفا تربیت کو دھوکے کا داغ لگا۔

شکر ہے کہ۔ اس نے پھر شکر کیا۔ اگر کچھ ہو جاتا۔

کتنا مہربان ہے میرا رب۔ میری نیت تو ٹھیک تھی ناں میں اسے جیون ساتھی کی حیثیت سے پسند کر رہی تھی۔ میرا مقصد تفریح نہیں تھا۔

انسان کا لباس اس کی تہذیب ہوتی ہے۔ وہ کسی جانور کے ہتھے چڑھنے لگی تھی؟

اتنی محنت اس نے آج کے دن کے لیے کی تھی۔

وہ گھر میں داخل ہوئی۔ امی تارا کو سوپ پلا رہی تھیں۔

السلام علیکم۔ اس نے روزانہ کے انداز میں سلام کیا۔

وعلیکم السلام۔ انہوں نے اس کا چہرہ بغور دیکھا۔

جلدی آ گئیں سارا۔ طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟

جی امی بس ایسے ہی سر میں درد ہے۔ میں کھانا نہیں کھاؤں گی۔

تو پھر دودھ ضرور پی لو۔ بھوکی مت رہو۔

امی میرا جی کسی چیز کو بھی نہیں چاہ رہا۔

وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ دروازہ بند کر لیا بیڈ پر گر کر وہ ہچکیوں سے روئی۔ انسان اپنی نظر میں خود ہی گر جائے تو اس کے لیے کوئی چارہ گری نہیں۔

وہ گھٹ گھٹ کر رو رہی تھی۔ خوف تھا کہ آواز باہر نہ چلی جائے۔ بڑی دیر اس نے اپنے اندر کی وحشت پر نوحہ کیا۔ دیر تک اپنی حماقت پر ماتم کیا۔

اس کا جی چاہ رہا تھا خودکشی کر لے۔ یہ میں نے اپنے ضمیر میں ہمیشہ کے لئے کیسی دراڑ ڈال دی ہے؟

وہ دن کتنے ہلکے پھلکے تھے۔ جب مرد کی بھٹکتی نظر۔ مرد کی وارفتہ نظر کا ادراک نہیں رکھتی تھی۔ جب اس نے اپنے اتنے پیارے والدین کو دھوکا نہیں دیا تھا۔ اگرچہ یہ آج بھی ناواقف ہیں۔ چار ملاقاتوں پر اس ستار العیوب نے پردہ ڈال کر رکھا تھا۔ ورنہ بات کوئی بھی ہو کب تک پردے میں رہتی ہے۔

اگر آج وہ اپنی بیوی کی بدصورتی کی کڑواہٹ میرے ضمیر کو منتقل کر دیتا تو۔ تو۔ میں کہاں جاتی۔

اگر گھر میں نوکر نہ ہوتے؟

اگر۔ اگر۔ بس اگر کے بعد وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیتی۔ ایسا لگتا۔ جیسے در و دیوار اسے پرنسس کہہ کر قہقہے لگا رہے ہوں اور جب اس کا ذہن گہری نیند میں ڈوب رہا ہوتا تو آخر سوچ یہ تھی کہ۔

بعض لوگ اپنا مقصد پانے کے لیے کتنی محنت کرتے ہیں اور۔ اور اب وہ اس کا تصور بھی ذہن میں نہیں لاتی۔

رات ہوائیں تیز بہت تھیں بادل ٹوٹ کے برسا تھا
گلیاں کوچے جل تھل تھے سوچ کا صحرا پیاسا تھا

تین دن بعد بارش تھمی تھی وہ گم سم سی ماں کے ساتھ گھر کے کاموں میں مصروف تھی کہ اسی وقت پوسٹ مین نے نیلا لفافہ تھمایا تھا۔

اس نے کانپتے ہاتھوں سے لفافہ کھولا تھا۔ منوچہر کا خط تھا۔ اسے شکوہ تھا کہ اس دن وہ ادھوری ملاقات کرکے آئی تھی وہ اس سے گفتگو کا طالب تھا۔

اس نے خط پڑھ کر نذر آتش کر دیا۔ ملال آنسو بن کر اس کے رخسار پر ڈھلک آیا تھا۔

پھر اس کے کئی خطوط آ خفگی سے بھرے۔ چوتھے خط میں اس نے بتایا تھا کہ وہ ہار ماننے والا نہیں ہے۔ وہ محبت کے علاوہ اسے طاقت سے جیت سکتا ہے کہ وہ اسے دل و جان سے چاہتا ہے۔

وہ اس خط کے جواب میں بھی خاموش رہی۔

پھر اس کا فون آ گیا۔

وہ بات کرنا نہیں چاہتی تھی مگر کرنا پڑتی تھی۔ اگر فون وہ نہ سنتی تو گھر میں سے کوئی بھی فون سن لیتا۔

ہیلو۔

محروم بول رہا ہوں۔

جی؟

ناراض ہو؟

جی نہیں۔

پھر کیا بات ہے؟

کچھ نہیں۔

سارا۔ دیکھو میری آزمائش نہ کرو۔ بہت ضدی آدمی ہوں میں۔

میری شادی ہو رہی ہے۔ اس کی آواز بہت آہستہ تھی۔

ایسا ہو سکتا ہے؟

ایسا ہو رہا ہے۔

تم اچھا نہیں کر رہی ہو سارا۔

میں۔ فون بند کر رہی ہوں۔

کیا شادی اسی کزن سے ہو رہی ہے۔

ہوں۔ اس نے ہنکارا بھرنے کے انداز میں جواب دیا۔

اب نہیں ہوگی۔ جانے اس کی آواز میں کیا تھا کہ سارا کو اپنے وجود میں سرد لہریں دوڑتی محسوس ہونے لگیں۔

دوسری جانب کھٹاک سے فون رکھ دیا گیا۔

وہ فون کے پاس سے ہٹی تو اندر سے جیسے کوئی چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ وہ دلدل میں دھنس چکی ہے۔

اور پھر ہوا بھی یہی۔

وہ اپنے مخصوص ٹائم پر کالج سے گھر واپس آئی تھی۔ جانے کیوں اسے گھر میں غیر معمولی خاموشی کا احساس ہوا۔ امی بے حد چپ تھیں، پاپا بھی آج آفس نہیں گئے تھے۔ یہ تو اسے صبح ہی سے معلوم تھا۔

اس نے کپڑے بدلے، منہ ہاتھ دھویا۔ کچن میں جا کر کھانا کھایا۔

واپس آ کر اپنے کمرے میں لیٹ گئی۔ اور گھر کی غیر معمولی کیفیت پر غور کرنے لگی۔ مگر بظاہر کوئی نتیجہ ہاتھ نہ لگا تو تھکن کے باعث جلدی سو گئی۔

شام کو اٹھی تو وہی دوپہر والا عالم تھا۔

وہ برآمدے میں آ کھڑی ہوئی۔ امی تارا کے بال بنا رہی تھیں۔ اس کے وجود کو محسوس کر چکی تھیں مگر اسی زاویے سے بیٹھی رہیں۔ پھر تارا کو ہوم ورک کی تلقین کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

سارا۔

جی امی۔

اندر آؤ۔ ان کا طرزِ عمل اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

وہ ان کے پیچھے پیچھے چلی آئی۔

وہ اس کے بیڈ پر بیٹھ گئیں۔

سارا۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ لوگ بیٹی کی پیدائش پر بجھ کیوں جاتے ہیں۔ کیونکہ جوان ہونے پر والدین کی عزت کی ٹھیکیداری اسے مل جاتی ہے۔

سارا کا دل انجانے خدشات سے لرزنے لگا۔

سارا۔ ہم نے تمہارے ساتھ کبھی برا نہیں کیا۔ سمیع سے زیادہ اہمیت دی۔ ان کی آواز بھرا گئی تھی۔

سارا کے پاؤں تلے سے جیسے زمین کھسک گئی تھی۔

امی اٹھیں اور ایک بڑا سا سفید لفافہ دراز میں سے نکال کر لائیں۔

اسے پڑھو۔ پڑھو۔ میرے سامنے۔

سارا نے کانپتے ہاتھوں سے لفافہ کھول کر دیکھا اس میں کئی کاغذات تھے۔ اس نے باریک سفید لفافہ پہلے کھولا یہ لاہور سے خالہ جان کا خط تھا۔

ساجدہ

خوش رہو۔

سمجھ میں نہیں آ رہا کہاں سے شروع کروں۔ تم میری چھوٹی سگی اور لاڈلی بہن ہو۔ جو میں لکھنے جا رہی ہوں شاید تو تصور بھی نہ کر سکو کہ یہ سب لکھتے ہو کتنی اذیت سے گزر رہی ہوں۔

ساجدہ انسان کو اپنے تمام اعضاء عزیز ہوتے ہیں لیکن کسی عضو کی وجہ سے تمام جسم میں زہر پھیلنے کا خدشہ ہو تو اسے کاٹ دیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس عضو کی بنا پر ایک ادھورے پن کا احساس مستقل ہو جاتا ہے۔

آخر جوان لڑکیوں کو یہ احساس کیوں نہیں ہوتا کہ وہ اپنے باپ کی دستار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یقین کرو جب منصور نے یہ سب چیزیں جو میں تمہیں بھیج رہی ہوں لا کر میرے سامنے رکھیں تو جیسے میرے خون کی گردش رک گئی۔ شاید منصور میرے اصرار پر سارا کو اپنا ہی لیتا۔ لیکن سارا سے ایسا بھیانک غلطی سرزد ہو گئی ہے کہ شاید اسے کوئی اپاہج شخص بھی اپنانا گوارا نہ کرے۔

میری بہن اب تو تم بھی لاعلم نہیں ہو گی کہ جب لاہور تک آگ آ گئی ہے۔ تو پھر یہ تو آگ بھی تمہارے گھر کی ہے۔

مجھے بیحد صدمہ ہے کہ تمہاری اولاد نے تمہارے ساتھ اچھا نہیں کیا۔

میں ہر قسم کی مدد سے قاصر ہوں۔ فقط

تمہاری آپا۔

سارا کے جسم سے گویا کسی نے خون نچوڑ لیا۔ اس نے دوسرے کاغذات دیکھے۔ اس کے خطوط تھے۔ جو اس نے منوچہر کو لکھے تھے بلکہ ان کی فوٹو اسٹیٹ کاپیں تھیں۔ ایک خط منوچہر کا بنام منصور تھا۔ جس میں سارا کے متعلق بہتان بھی تھے۔ کہ جنہیں سن کر زمین کا سینہ بھی شق ہو جا۔

وہ کھڑی نہ رہ سکی۔

نیچے قالین پر بیٹھ گئی۔

کون ہے یہ؟ امی کی شکستہ آواز ابھری

سارا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

سارا۔ تجھے اب ساری عمر رونا ہے بتا۔ کون ہے یہ؟

امی۔ یقین کریں امی اس خط میں جو لکھا ہے غلط ہے۔ اس نے منوچہر کا خط ماں کے آگے کیا۔

مجھے یقین آ بھی جاتا تو کیا اور اسی یقین و اعتماد نے یہ گل کھلا ہیں۔ سارا۔ اس کا پتا بتا دو۔ تا کہ پالی فرصت میں تمہیں اس کے ساتھ رخصت کر دیا جا۔

سارا کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ کبھی یہ بات اسے دیوانے کا خواب معلوم ہوتی تھی۔

امی۔ میں نے اسے نہیں چاہا تھا۔ امی آپ مجھے غلط نہ سمجھیں۔

سارا لوگ جب تیرے حسن پر رشک کرتے تھے تو مجھے تیری خوبصورتی سے خوف آتا تھا۔ کتنا صحیح خوف آتا تھا۔ اس کی تروتازہ سی ماں کیسی بوڑھی سی لگنے لگی تھی۔

اس نے رو رو کر الف سے لے کر ے تک تمام بات سنا دی۔

وہ سر جھکائے سنتی رہیں۔

اور وہ جو اس نے خط میں لکھا ہے۔ وہ جھجک کر رک گئی تھیں۔

امی خدا کی قسم میں نے تو اس سے ہاتھ تک نہیں ملایا کبھی۔ بہتان ہے مجھ پر اس گھر میں رہتی ہوں۔ آپ کی نظروں کے سامنے۔ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ اب اس قدر بھی نابینا نہیں تھیں وہ۔ چار بچوں کی ماں تھیں۔

لیکن سارا اب وہ جو کوئی بھی ہے۔ تجھے اسی کو اپنانا ہوگا کہ اس نے تجھے کسی اور کے قابل نہیں رکھا۔

خدا کے لیے امی۔ اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔ مجھے اس شخص سے نفرت ہے۔ میں مر جاؤں گی۔ میں ایک لمحہ اس کے ساتھ نہیں گزار سکتی۔ پھر ساری عمر۔

وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ ساجدہ اسے غور سے دیکھتی رہیں۔

پھر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ سارا تو نے سب کے پاؤں تلے انگارے بچھا دیے ہیں۔ تو نے اپنے بھائی سے مردانگی کا غرور چھین لیا ہے۔ شاید تجھے ساری عمر معاف نہ کر سکیں۔

وہ باہر نکل گئیں۔ وہ دیر تک تڑپ تڑپ کر روتی رہی۔

واقعتاً۔ اسے منوچہر سے اس قسم کے اقدام کی توقع نہیں تھی۔

اتنا بڑا شرمناک الزام۔ اس کا جی چاہا کچھ کھا کر سو رہے۔

خوشبو بھول کی طرح مجھے کھلنے کا شوق تھا
اب تیز ہے ہوا، تو ہوا کا قصور کیا

اسے منوچہر کا کوئی خط نہیں ملا مگر پاپا کے پاس دھمکی آمیز فون آئے۔ وہ سارا سے فوری نکاح مانگ رہا تھا۔ سارا کی ایک ہی گردان تھی۔ نہیں۔ نہیں۔

ایک روز پاپا کو ٹائپ لیٹر ملا۔

جس میں منوچہر نے اپنی اولین پسند کو اٹھا لے جانے کی دھمکی دی تھی۔ لکھا تھا وہ ایک بااثر زمیندار خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اور اس کے لیے کوئی کام مشکل نہیں ہے۔

اب تک اس نے شرافت کا مظاہرہ کیا ہے۔

ساجدہ کا ایک دل کہتا کہ اس مصیبت کو انگلی سے پکڑ کر منوچہر کے در پر چھوڑ آئیں۔ پھر بیٹی کے اعترافات میں سے ایک جملہ ان کے کانوں میں گونجنے لگتا۔

امی۔ وہ ایسا نہیں لگتا تھا۔ میری شادی اس سے کرنے سے بہتر ہے آپ مجھے جان سے مار دیں۔

کئی دن ایسے گزرے کہ کھانے پینے تک کا ہوش نہیں تھا۔ پولیس سے مدد لینا مزید مشکلات و مصیبت مول لینا تھا۔ بات ابھی حدود میں ہی تھی۔

ایک شام امی نے اسے تیار ہونے کو کہا اور یہ کہ وہ اپنے چند جوڑے سوٹ کیس میں ڈال لے۔ اس نے گھبرا کر ماں کی صورت دیکھی۔

تمہارے ماموں حفیظ پنجاب کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ٹیچر ہیں۔ معلوم ہے تمہیں

اس سے قبل کے وہ دھمکی کو عملی جامہ پہنائے۔ تمہیں وہاں چھوڑ آتے ہیں۔ پھر ہم خود یہاں سے شفٹ ہو جائیں گے۔ کیسا ہارا ہوا انداز تھا ان کا۔

ایک طویل سفر کے بعد۔ وہ اس گاؤں میں آئے تھے۔

امی نے بھائی کو ڈھکے چھپے الفاظ میں بات بتا کر ان سے مدد کی التجا کی۔ بھائی بہن کے المیے پر رو پڑا تھا۔ اور کوئی اسے دیکھتا جس کی پلکوں پر منوں بوجھ رکھے تھے۔ حفیظ ماموں خود بے اولاد تھے گزشتہ سال ان کی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا۔ اب بالکل تنہا تھے۔

جب امی جانے لگیں تو وہ ان سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

امی مجھے معاف کر دیجیے گا۔

انہوں نے آہستگی سے اسے خود سے علیحدہ کیا۔

بچے ماں باپ کی احتیاط کو ان کی حماقت سمجھتے ہیں۔ تو نے ان کٹھن حالات میں اندازہ کر لیا ہوگا۔ ماں باپ کیا ہوتے ہیں۔؟ یہی کچھ اگر تو کسی اور کے ساتھ یہ کچھ کرتی تو تیری سات پشتوں کو بھگتان بھگتنا پڑتے،، بھگتنے تو شاید اب بھی پڑیں تو جہنم میں کودی ہے سارا ہم نے تیرے لیے بہت خوبصورت خواب دیکھے تھے۔

وہ سسک پڑیں۔

ماموں جان نے بہن سے بہنوئی کی شکستگی پر اپنے دل میں طوفان سے اٹھتے محسوس کیے تھے۔ وہ انہیں شہر جانے والی بس میں بٹھا کر آگئے تھے۔ اس بس نے انہیں لاہور اسٹیشن پر پہنچا دیا تھا۔

وہ واپس ہوئے تو وہ ڈیوڑھی میں پتھر کی طرح ایستادہ تھی۔

پیاسا ہوں ریگزار بھی دریا دکھائی دے
جو حال پوچھ لے وہ مسیحا دکھائی دے

ماموں جان نے اس سے کوئی بات نہیں دریافت کی انہیں شاید زیادہ بولنے کی عادت بھی نہیں تھی۔

اس کا بے حد خیال رکھتے اس کی زندگی تو جیسے ایک کنویں میں محدود ہو گئی تھی۔

اس نے بار بار اپنی غلطی و جزبات پر ہاتھ ملے تھے۔ لیکن وہی مثل صادق آتی تھی۔ کہ عمر

چرا کار کند عاقل کہ باز آید پشیمانی

یعنی عقل مند وہ کام ہی کیوں کرے کہ بعد میں شرمندگی اٹھائے۔

بعض لوگ پیدائشی عقل مند نہیں ہوتے۔ انہیں ٹھوکر سے عقل آتی ہے۔ گاؤں کی لڑکیوں سے اس کی دوستی ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی ان کے ہمراہ کھیتوں باغوں میں نکل جاتی تھی۔

ایسی ہی اندھیری شام وہ اور دیہاتی لڑکی عائشہ ڈور ڈنگروں کے پیچھے باتیں کرتی آ رہی تھیں۔ دو کسرتی

ماموں کے مالک نوعمر لڑکے ان کے سامنے آ گئے۔ وہ دونوں ٹھٹک گئیں۔

سارا۔ دونوں نے باری باری دونوں لڑکیوں کو دیکھ کر گویا اندازہ لگایا۔ پسینہ بہہ کر سارا کی ایڑیوں میں آ گیا عائشہ الگ ہکا بکا تھی۔ مالک نے کہا تھا کہ آپ سے کہوں کہ مالک یاد فرماتے ہیں۔ ان میں سے ایک نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

میں سارا نہیں ہوں۔ اس نے بمشکل آواز نکالی۔

مالک نے کہا تھا۔ جس کے گلابی گال پر کالا تل ہو، جو نظر جھکا کر بات کرے۔ جسے دیکھ کر زندگی سے محبت ہونے لگے۔ وہی سارا ہو گی۔ ویسے فوٹو ہے ہمارے پاس مالک نے یہ بھی بولا تھا۔ جس طرح کائنات میں ایک سورج ہے اسی طرح بس سارا بھی ایک ہے۔

پرے ہٹ۔ دفع ومرے۔ ٹٹ پینے۔ عائشہ نے بھڑک کر اس نوجوان کو پیچھے دھکا دیا جو بہت بول رہا تھا۔ لیکن اس نوجوان پر دھکے کا کوئی اثر نہ ہوا۔ معاً عائشہ کے منہ سے خوف زدہ سی چیخ نکلی۔

چلو۔ ریوالور کی سیاہ نال چمک رہی تھی۔ دونوں ان کی جانب متوجہ تھے۔ عائشہ آنکھ بچا کر سرپٹ دوڑ لی۔ ان دونوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔

ہم تو کراچی سے تم پر نگاہ رکھے ہوئے ہیں۔ پر موقع بھی کوئی چیز ہوتی ہے، وہیں پکڑ لیتے تو دھر لئے جاتے، ویسے یہاں کام ذرا سکون سے ہو گیا۔ مالک نے کہا تھا اس زمین پر چھ براعظم اور سات سمندر اور باقی ہیں وہاں بھی جا کر دیکھ لیجئے۔ اس سے بھی بڑے گاؤں کا وارث ہے ہمارا مالک۔

عائشہ کو دوڑتے دیکھ کر اس کی حالت غیر ہو گئی تھی۔ دونوں نے اپنے اپنے ریوالور سے اسے کور کر رکھا تھا۔

انٹرکان لاہور میں مالک آپ کے منتظر ہیں۔

کک کک۔ کک۔ کون ہو تم لوگ۔

ہم جو بھی ہیں اپنے مالک کی روٹیوں پر پلے ہیں۔ اب تک بڑی تمیز سے پیش آ رہے ہیں کہ ہونے والی مالکن ہو مگر۔

اس نے محسوس کیا چاروں طرف سناٹا ہے۔

آگے بڑھو۔ وہ اسے ہنکانے لگے۔ لیکن اس کی ٹانگیں تو جیسے بے جان ہو گئی تھیں۔

دونوں نے اسے بازوؤں سے تھام لیا اور تقریباً گھسیٹنے لگے۔ معاً تڑ تڑ کی آوازیں فضا میں گونجیں۔ وہ تیورا کر زمین پر گر گئی تھی۔ کافی دیر بعد اسے ہوش آیا تو اس نے چاروں سمت دیکھا ماموں کے ہاں ہی تھی بڑے کمرے میں۔

ماں باپ کا قصور یہ تھا کہ وہ اس کے ماں باپ تھے ماموں کا نا کردہ گناہ بھی یہی رقم ہوا تھا کہ وہ سارا کے ماموں تھے۔

عائشہ کو راستے میں بھائی مل گیا تھا۔ جسے اس نے جلدی جلدی تمام بات بتائی اس نے نمبردار کے لڑکے کو ساتھ لیا اور مدد کو پہنچ گیا تھا۔

رائفل نمبردار کے پاس تھی یوسف نہتا تھا۔ اور گولیوں سے بال بال بچا تھا۔ پہلی گولی کی آواز پر جانے کہاں سے دوسرے دیہاتی نمودار ہوئے ۔

دونوں نوجوانوں کو پانچ چھ آدمیوں نے بمشکل قابو کیا۔

ان کے ہاتھ رسیوں سے باندھ دیئے۔ دوران کی گاڑی کھڑی نظر آ رہی تھی۔

نہ جانے وہ نوجوان کیا اول فول بک رہے تھے یوسف معرکہ میں مگن تھا۔ عائشہ نے کھیت میں کھڑے ہو کر ساری کاروائی ملاحظہ کی۔

یاد رکھو۔ یہ لڑکی بچے گی نہیں۔ یہ ہمارے مالک کے بچے کی ماں بھی ہے۔

The End---------------------اختتام

روگی

از

رفعت سراج

اور کچھ یوں ہے کہ اب بھی حوصلہ جینے کا ہے۔
میں نے روشن کر لیا سینے میں دل بجھتا ہوا

یااللہ۔۔۔اف وہ کشن پر سے قالین اٹھتے ہو کراہی۔

یاالٰہی بچے ہیں کہ۔۔۔اس نے سیٹی گھسیٹتے ہوجلاّ کر سوچا۔

ڈرائنگ روم، جنگ سے تباہ حال علاقے کا منظر پیش کر رہا تھا۔

کوئی تو صفائی پسند ہوتے ہیں اور کوئی صفائی کے جنونی وہ دوسری قسم سے تعلق رکھتی تھی اس لیے جھلاّہٹ سوار تھی۔ فردوس پھپھو کو انگلستان سے آ ہو آج چوتھا روز تھا۔ ان چار روز میں وہ ان کے خود اعتماد بچوں کے ہاتھ مداری کی بندریا بنی ہوئی تھی جن کی حاضر جوابی، شوخ و شنگ مزاج اور اٹھا پٹخ کو ان کی ذہنی گروتھ کا لازمی جزو جان کر ماں ان حرکتوں پر داد و تحسین کے ڈونگرے برساتی تھیں۔ پھپھو کی دیورانی اور ان کی سہیلی بھی پھپھو کے ہمراہ تھیں۔ ان کے بچے بھی ہمراہ تھے البتہ سہیلی کے بچے بلکہ بچیاں جوان تھیں۔ پھپھو اور ان کی دیورانی اپنے بڑے بچے گھروں میں چھوڑ آئی تھیں۔

ان کی آؤ بھگت میں وہ پیش پیش تھی۔ ان کے علاوہ سیر سپاٹے کے لیے لے جانا بھی اس کے فرائض میں شامل تھا۔۔۔ کیونکہ بڑے بھیا کو اپنے آفس سے فرصت نہ تھی۔ چھوٹے بھائی جان، رسالپور میں تھے۔ فرح چھوٹی تھی۔ ڈولی اور کیٹی تھیں۔ دونوں اسے روبوٹ کی طرح کام کرتا دیکھتیں اور حیران ہوتیں۔ نوکروں سیکام لیتی گھر کی صفائی کراتی، آتی جاتی ماں سے ٹھٹھول کرتی، ان کے آرام کا خیال کرتی، ان سے خوش گپیاں کرتی اور تو اور وہ اسے اس وقت حیرانی سے گھورا کرتیں جب وہ انہیں سیر کے لیے لے جاتی۔ پھولے پھولے سرخ رخساروں پر مسکراہٹ سے گڑھے پڑ جاتے، دوپٹا کانوں کے پیچھے اڑسے جب کسی مشاق ڈرائیور کی طرح گاڑی چلاتی۔ اپنا آپ سے بے پروا مخلص سی لڑکی انہیں بہت بھائی تھی۔ آج بھی وہ انہیں چائنیز ریسٹورنٹ لائی تھی۔ پھپھو ہمراہ نہیں تھیں، باقی سب تھے۔

ارے، یہاں کی بسیں کیسی ہیں جیسے ردی لوہے کی چاردوں سیکام لیا گیا ہو۔ کیٹی نے انگریز میں سب سے مخاطب ہو کر کہا تھا۔ لوگ کتنا آرام سے بیٹھے ہیں جیسے بوئنگ سات سو پینتالیس کے وی آئی پی۔۔۔ پھپھو کے چودہ سالہ ارسلان سمیت سب کے بلند و بانگ قہقہے گاڑی کی چھت پھاڑنے لگے۔

ارے سعدیہ یہ اتنی گاڑیاں جو سڑک پر دوڑ رہی ہیں، ان گاڑی والوں کے گھر کہاں ہوتے ہیں یہاں تو ہر طرف چار چار بلاک کے کابک نظر آ رہے ہیں۔

سعدیہ نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر موڑ کاٹا۔

ارے سعدیہ یہاں تو کچھ بھی نہیں رکھا۔ سچ ہمارے ساتھ چلو، تب تمہیں معلوم ہوگا کہ زندگی کیا ہے، کیوں ڈولی۔۔۔؟ کیٹی نے بہن کی تائید چاہی۔

ہوں اور کیا۔ ڈولی نے گویا تائید کر دی۔

شکریہ فرینڈز ہماری زندگی تو یہی ہے۔۔۔ یہ پیارا وطن ہیا۔ ہمارا۔۔۔ ہمیں اچھا لگتا ہے۔

کیا اچھا لگتا ہے؟ ڈولی نے اپنی دانست میں ٹھٹھول کیا۔

مٹی۔۔۔ اس نے گیئر بدلا۔

مٹی؟؟ ہاہا۔۔۔ ہاہا۔۔۔

معاف کرنا۔۔۔ ڈولی۔۔۔ پلیز، آئندہ میرے سامنے اس قسم کی گفتگو نہ کرنا۔ اس نے کھولتے لہو کو دبا کر رسانیت سے کہا۔ اگر کوئی ماں کو گالی دے تو اولاد کبھی برداشت نہیں کر سکتی۔

۔۔۔ پھر میں کیسے برداشت کر سکتی ہوں۔

ڈولی اور کیٹی اسے حیران نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

اس نے ونڈ اسکرین تر آنکھیں جما کر کہا۔

نہ غربت تحقیر کے لئے پیدا کی گئی ہے، نہ امارت ستائش کے لیے۔۔۔ ہر کوئی اپنے اپنے ٹھکانے، ماحول سے مانوس ہو جاتا ہے۔ ہم غریب ہی ٹھیک ہیں محنت کر رہے ہیں، کبھی ہماری بھی صبح ہوگی۔

وہ کس قدر سنجیدہ ہو گئی تدی۔ دونوں لڑکیاں بلکہ ماں تک خفیف سی ہو کر رہ گئی تھیں۔۔۔ وہ تو سمجھ رہی تھیں کہ یہ شاندار امپالا ڈرائیور کرنے والی یقیناً دیار غیر کے خواب دیکھ رہی ہوگی اور انہیں اپنی شان و شوکت کے گیت گنگنانے کا بہتر موقع مل گیا ہے۔ یہ بھی انسان کی فطرت ہے کہ دوسروں کو خود سے کمتر جان کر نہ جانے اپنے کس جذبے کی تسکین کرتا ہے۔۔۔ مگر اس پراعتماد، وطن پرست لڑکی سے منہ کی کھا کر رہ گئی تھیں۔ ادھر اس کا موڈ سخت آف ہو گیا تھا۔

نہ جانے لوگ یہاں آ کر مہمان بن کر جی جلانے کو کیوں آ جاتے ہیں۔ اس طرح بڑھ بڑھ کر بولیں گے جیسے تاج برطانیہ کی وراثت میں کسی نمبر پر لگے ہوں۔

اونہہ۔۔۔ وہ تو وطن کے معاملے میں نہایت حساس تھی۔ قومی تقریبات میں وہ محبتوں کے ڈونگرے برسا کر اپنے دل کی بھڑاس نکالتی تھی کہ جج اس کی جوشیلی بھڑاس پر اسے تمغوں سے نواز دیا کرتے تھے۔

وہ سوچتی تھی۔۔۔ وطن سے متعلق وہ جس قدر حساس ہے شاید کوئی اور نہ ہو۔

اور یہ پاکستانی نژاد برطانوی، امریکی شہری جب یہاں آتے ہیں تو انتہائی کم ظرفی سے اسی مملکت کے خلاف زہر اگلنے لگتے ہیں۔۔۔ مار آستین۔

سوری ڈیئر، تم نے مائنڈ کیا۔ کیٹی نے نچلا ہونٹ کاٹتی سعدیہ کو معذرت طلب نظروں سے دیکھا۔

اور وہ گاڑی پارک کرتے ہو دلکشی سے مسکرا دی۔ جیسے کہہ رہی ہو ارے نہیں بڑے کشادہ دل ہیں ہم۔۔۔ تمہاری ذرا سی سوری آگ اگلتی دھرتی پر ساون کا پہلا چھینٹا ثابت ہوئی ہے۔

مگر سعدیہ۔۔۔ اے بھئی تم کوئی سیاست دان تو نہیں ہو جو اتنا سنبھل کر بول رہی ہو کہ پریس سے ڈر لگتا ہے۔۔۔ بھئی جو دل میں ہے کہہ دو۔ وہ کھسیانی ہنسی ہنسیں۔

ارے آنٹی، ہم ایک بار کہتے ہیں اور دل کی کہتے ہیں۔ وہ مروت سے مسکرائی۔۔۔ اور اس روز کے بعد واقعی اس قسم کی گفتگو نہیں ہوئی۔

تمام گھر والوں نے حق مہمان نوازی خوب ادا کیا۔ آخر کار یہ سب تین ہفتوں بعد کراچی آ گئے۔ گھر میں ایک دم ایسا محسوس ہوا جیسے کہ ابھی ابھی سفید جھنڈا لہرایا گیا ہو۔

ابھی ان مہمان نوازیوں سے فارغ ہو کر بیٹھی تھی کہ اس کا بیائی جی کا رزلٹ آؤٹ ہو گیا۔ آنے جانے والوں کا تانتا بندھا رہا۔ امی کی ملنسار طبیعت کے باعث ان کی دوست بھی بیحد و حساب تھیں، انہیں آنے جانے والے لوگوں میں اپنا کام دکھانے والے بھی آ گئے۔

گھر میں کھچڑی سی پکنے لگی۔

نہیں۔

نہیں وہ۔

مگر نہیں۔۔۔ وہی ٹھیک ہے۔

والدین نے تمام کام کر کے خانہ پوری کے لیے چھوٹی خالہ کو اس کے پاس بھیجا کہ بول تیری رضا کیا ہے؟

اور چھوٹی چچی بہترین سفارت کار کے فرائض نبھانے لگیں۔

بہت خوبصورت ہے، تعلیم یافتہ ہے۔

بڑا چھوٹا کنبہ ہے۔۔۔ چھوٹے بچے نہیں، اگر ہو بھی تو بس تیرے ہی ہوں گے۔ وہ شرارت سے ہنسیں۔ وہ اس سے دو تین سال بڑی تھیں، اس لیے سہیلیوں کی طرح تھیں۔ اور اپنے بھائی صاحب اور بھائی جان کو تو بہت پسند آ ہیں وہ لوگ۔ وہ مزید بولیں۔ پھر مٹھی کھول کر سامنے کی۔ دیکھ۔۔۔ یہ دہا۔۔۔ میرے ہاتھ پر۔ وہ کھلکھلائیں۔

وہ ان کی طرف خاموشی سے دیکھتی رہی۔

ارے کیا منہ سی لیا ہے؟ مجھے جواب دینا ہے۔ وہ بیزار ہو کر بولیں۔ اچھا چل میں پیٹھ کیے لیتی ہوں۔ خوب غور سے دیکھ لے۔

مگر وہ اسی زاویے سے بیٹھی رہی۔ وہ سلجھے ہو والدین کی بیٹی تھی۔

بھئی، مجھے نہیں پتا چھوٹی چچی۔

کیا نہیں پتا؟

بھئی، آپ سب لوگ بہتر جانتے ہیں۔

سعدیہ، دیکھ تو لے، کتنا شاندار ہے۔ انہوں نے تصویر اس کی ناک سے لگا دی۔

وہ بری طرح جھینپ گئی۔

اچھا چل میرے جانے کے بعد دیکھ لینا۔ وہ ساڑی کا پلو بدن سے چپکاتی ہوئی پھرتی سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

پھر جھک کر اس کا منہ چومتی ہوئی جانے کان میں کیا کہہ گئیں کہ وہ شرم سے کٹ کر رہ گئی۔

گھر میں ہنگامے اتر آئے تھے۔۔۔ یہ مشرقی شادی بیاہ کے ہنگامے الامان والحفیظ۔

اور جب اس نے دیکھا۔۔۔ کہ واقعی وہ ایسا ہی ہے جیسا بتایا گیا۔

خوبصورت۔۔۔۔ تعلیم یافتہ۔۔۔۔ سنجیدہ، پروقار۔۔۔ کم گو۔۔۔

سب کچھ تھا۔۔۔ من پسند تھا۔۔۔ مگر وہ اس وقت دھک سے رہ گئی جب سنا کہ وہ تو اسٹیٹ میں رہتا ہے۔

آج سے نہیں عرصہ پانچ برس سے۔

کیا مجھے بھی جلنا ہوگا؟ اس نے احمقانہ سوال کر ڈالا۔ مگر اب تو کر دیا تھا۔

کم گو آدمی کا تو ویسے ہی رعب ہوتا ہے۔۔۔ وہ سوال کر کے خود ہی خفیف سی ہو کر رہ گئی تھی۔

تب اس نے سیف سے کاغذات نکالتے ہوا ایک نگاہ بیوی پر ڈالی۔

اگر یہاں سے در و دیوار میری کمی پوری کر سکتے ہیں تو تم رہو شوق سے۔

وہ اس کے تبادہ لہجے پر سہم سی جاتی تھی۔

نہیں، میرا مطلب ہے کہ پاسپورٹ وغیرہ۔ وہ گڑبڑائی۔

کیا دیر لگتی ہے۔۔۔ مگر بہرحال تم میرے جانے کے بعد تقریباً دو ماہ بعد ہی آ سوگی۔ وہ بریف کیس میں کاغذات رکھ کر کھٹاک سے بریف کیس بند کرتے ہو گویا ہوا۔ پھر ٹٹولتی ہوئی نظروں سے بولا۔ کیا تمہارا دل نہیں چاہتا جانے کو؟

ارے نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔۔۔۔ جہاں آپ ہیں۔ مجھے تو وہیں رہنا ہے۔ اس نے بڑی دیر بعد عقلمندی کی بات کی۔

ہاں۔۔۔ اور دیکھنے کی چیزیں بھی وہیں ہیں۔۔۔ یہاں کیا رکھا ہے؟ وہ اخبار اٹھا کر بیڈ کی طرف آتا ہوا بولا۔

اور وہ پھر جھلس کر رہ گئی۔

کیا رکھا ہے۔۔۔؟

کیا رکھا ہے۔۔۔؟

پھر وہی دھرتی ماں کی شان میں گستاخی۔ اس کی غربت پر ٹھٹھول۔

نہیں خیر، دیکھنے کو تو یہاں بھی بہت کچھ ہے۔۔۔ اب اتنا بھی چھوٹا نہیں ہے یہ ملک۔ اس نے خود پا قابو پا کر بیڈ سے اٹھتے ہو کہا۔

ان باتوں سے اس کے احساس میں آگ بھر جاتی تھی۔ ساتھی بھی ملا تو انہی لوگوں جیسا پرائن گانے والا وہ کمرے سے نکل کر ساس کے پاس چلی آگئی۔

اور جب وہ فہد کے ہمراہ ذرا دیر کو گھر آئی۔ ذرا دیر سے مراد یہ کہ وہ کبھی اسے ایک رات کے لیے میکے نہیں چھوڑتا تھا۔ اسے یہ بات اچھی طرح معلوم تھی۔ کبھی گھر کا کوئی فرد خاص طور پر امی اسے ٹھہرانے کے لیے اصرار کرتیں تب وہ اس کے تاثر سے عاری چہرے کی سمت دیکھ کر کہہ دیتی تھی۔

پھر کبھی امی۔۔۔ آج بھی گھر کا بہت کام چھوڑ کر آئی ہوں، انشاءاللہ چند روز بعد کافی دن کے لیے رہنے آؤں گی۔

امی جانتی تھیں کہ اب ان کی سعادت مند بیٹی ایک شخص کی ذمہ دار بیوی بن گئی ہے۔

تو۔۔۔ آج وہ گھر آئی تو تنہائی میں چھوٹی چچی سے پیٹھ موڑ کر انگلیوں سے اشک پونچھتے ہو بولی۔

آپ نے یہ کیوں نہیں بتایا تھا کہ فہد امریکا میں سٹیل ہے۔

تم نے تو تصویر تک دیکھنا گوارا نہیں کی تھی۔ تم سے اس کے متعلق کیا بات کرتی اور پھر یہ بات تو ایسی تھی جو گھر میں باتوں باتوں میں تجھی معلوم ہو سکتی تھی اور تم رو کیوں رہی ہو؟ وہ اسے اپنی جانب موڑتے ہو بولیں۔

تب وہ سسک پڑی۔

چھوٹی چچی، کتنی دور پھینک دیا مجھے اٹھا کے۔

پگلی، تجھے ذرا خوشی نہیں، لڑکیاں تو امریکا کے خواب دیکھتی ہیں۔۔۔ پاگل کہیں کی، ہم تو سمجھے تھے کہ تجھے پتا ہوگا۔۔۔ اچھا چلو چپ ہو۔۔۔ روتے نہیں۔

سیر و تفریح تک تو ٹھیک ہے۔۔۔ اب نامعلوم عرصے تک کے لیے اتنی دور۔۔۔ وہ پھر رو دی۔

سعدیہ کیا بات ہے؟ چھوٹی چچی نے اسے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ فہد تو تمہارے ساتھ ٹھیک ہیں؟

ارے نہیں وہ تو بہت اچھے ہیں۔۔۔ اتنی دور۔۔۔ اکیلے۔۔۔ ڈر لگے گا مجھے۔

اچھا تیز موٹر چلاتے ہو تجھے ڈر نہیں لگتا۔۔۔ اب تمہارا اپنا گھر ہے۔ تمہیں اپنا گھر بنانا ہے، سنبھالنا ہے۔ آج جن لوگوں کے لیے تم رو رہی ہو، کل ان سے ملنے کی تمہیں فرصت نہ ہوگی۔ اب رونا نہیں، بھابی جان تو ویسے ہی افسردہ ہیں۔ چلو اٹھو شاباش موڈ ٹھیک کرو۔ رکو گی نا آج تو۔۔۔؟ آج اس کا جی چاہا تھا کہ سچ بول ڈالے کسی سے تو۔

دیکھ تو کتنی خوش قسمت ہے۔۔۔ کتنی محبت کرتے ہیں فہد۔

جی۔ اس نے اکھڑا ہو لہجے میں کہا۔ جیسے اس جملے میں کوئی کشش نہ تھی۔ ابھی میکے کی یاد بھولی تو نہ تھی، اس کا دل تو چاہتا تھا رہنے کو۔

آج فہد چلے گئے تھے۔، وہ تھکی تھکی سی اپنے کمرے میں چلی آئی۔ جاتے جاتے وہ اسے کس طرح بے کل کر گئے تھے۔۔۔ اتنی بے ساختگی تو ان جودہ دنوں میں نہ دیکھی تھی۔ شام کو ان کی فلائٹ تھی۔ وہ صبح سے اپنے کمرے میں بیڈ پر دراز رہے۔ گلابی یوک والی ڈھیلی شرٹ اور شلوار میں وہ اداس اداس لگتے تھے وہ بھی مصروف تھی مگر فہد نے اسے کئی گھنٹے تک باہر نہ جانے دیا۔

ان کی مہک پورے کمرے مین رچی ہوئی تھی۔ اپنی انمول عمر میں آج اسے ایک نیا تجربہ ہوا تھا۔

تڑپنے کا۔۔۔

سسکنے کا۔۔

اور رت جگے کا۔

صرف پندرہ دن میں کوئی مرد عورت کی کائنات بدل سکتا ہے۔۔۔ پھر اسے یاد آیا، اس کی کائنات پندرہ گھنٹے میں ہی بدل گئی تھی۔

یوں بھی کوئی ہر دم اس کے گھٹنے سے تو نہیں لگا بیٹھا رہتا تھا، سرِ شام ہی ملتے تھے مگر نہ جانے یہ کیسے جذبے تھے، تن من کو خاکستر کر دینے والے۔ اس کے دو کنوارے دیور تھے، ایک نند تھی جو شادی شدہ تھی۔ سسر حیات نہیں تھے۔ بڑا مہذب سلجھا ہوا گھرانا تھا۔ جب اس نے اپنی ساس سے میکے جانے کے لیے اجازت طلب کی تو انہوں نے فوراً ہی دے دی بلکہ خود ہمراہ آئیں اور ایک روز ٹھہریں۔

دن ہوا سے گزر گئے۔

آج اس نے پاکستان سے شکاگو تک کا سفر تن تنہا کیا تھا۔

ضروری کارروائیوں سے فارغ ہو کر وہ ہراساں سی شکاگو ایئرپورٹ پر کھڑی تھی۔ اجنبی جگہ، اجنبی دیس، مشین کی طرح اپنے آپ میں گم گزرتے ہوا اجنبی لوگ۔۔۔ تیز بارش کے بعد ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ سیاہ اور مختلف چھتریاں تا حدِ نگاہ نظر آ رہی تھیں۔ فہد نظر نہ آیا تو وہ رو ہانسی ہو گی۔ اس نے سوٹ کیس پر ایڈریس لکھی چٹ کو دیکھا۔۔۔ خود اعتمادی میں دراڑیں پڑ رہی تھیں۔ اتنے اجنبی لوگوں کی بھیڑ میں اس کی ہمت نہ پڑی کہ ٹیکسی کو روکتی، تب ہی ایک خوبصورت سی گاڑی سے فہد اترتا نظر آیا۔ سیاہ پینٹ، سیاہ ہی اوورکوٹ کے کالر کھڑے کیے ہو، دستانے چڑھا، سیاہ گلاسز لگائے پورا امریکی لگ رہا تھا۔ اسے اپنی سمت آتے دیکھ کر جان میں جان آ گئی۔ مگر وہ نروس سی ہو گئی۔

ہیلو۔۔۔۔۔۔ جان اس نے اسے شانوں سے تھام لیا۔ ارے، اتنی سخت سردی میں تم نے یہ سویٹر پہنا ہوا ہے۔

مگر اسے تو گھبراہٹ میں سردی بھی محسوس نہ ہوئی تھی۔ تب وہ اس کے شانے سے لگ کر بولی۔

مجھے اتنا ڈر لگ رہا تھا۔۔۔ اتنی دیر لگا دی آپ نے۔

سوری۔۔۔ یہ غلطی دانستہ نہیں ہوئی۔۔۔ میں تو سمجھتا تھا، تم تعلیم یافتہ لڑکی ہو۔۔۔ مگر ابھی تو تم اب تک وہی فرسودہ مزاج والی پاکستانی گرل ہو۔

آتے ہی پہلا کچوکا لگا۔

اس میں فرسودہ ذہنیت کا کیا سوال ہے۔ نئی جگہ ہے بالکل، جھجک تو ہوتی ہے پہلی مرتبہ۔ یہ باتیں انہوں نے گاڑی تک آتے آتے کیں۔ سوٹ کیس فہد نے اٹھایا ہوا تھا اور بیگ اس کے ہاتھ میں تھا۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی فہد نے اپنا کوٹ اتار کر اس کے کاندھے پر ڈال دیا۔۔۔ کوٹ کی گرمائی نے اسے احساس دلایا کہ وہ کتنی دیر سے سخت سردی کی اذیت برداشت کر رہی تھی۔ کافی کشادہ فلیٹ تھا جو ہر آسائش سے پر تھا، اسے آرائش پر کوئی خاص محنت نہ کرنا پڑی تھی۔ ان سے نیچے ایک انڈین فیملی تھی جن کے ساتھ وہ کبھی کبھار شاپنگ کے لیے چلی جاتی تھی۔ فہد کی ملازمت کے کچھ اوقات ہی نہ تھے۔ اچھا بھلا سوتے سوتے فون آ گیا اور وہ ڈیوٹی کے لیے تیار ہونے

لگا۔

سخت بوریت کا عالم تھا۔ کھانا پکا کر تیار ہو کر ٹی وی آن کر کے بیٹھ جاتی۔۔۔ مگر جلد ہی اکتا جاتی، کھڑکی میں کرسی رکھ کر رونق میلا دیکھنے لگتی۔۔۔ مگر آنکھیں پتھرا جاتیں۔۔۔ تب احساس ہوتا کہ ذہن تو کہیں اور ہے۔

تب کہیں جا کر اس کی صورت نظر آتی۔۔۔ جو کہ روپیہ بنانے کی مشین نہیں فیکٹری بنا ہوا تھا۔۔۔ سارے انداز امریکیوں جیسے تھے مگر نخرے وہی پاکستانی شوہروں والے۔۔۔ یہ پاکستان نہیں ہے، سمجھیں۔ اس کے تنہائی کے شکوے پر وہ برس پڑتا۔ جہاں ہزار روپے کی نوکری کر کے باقی کام ادھار ہوں۔۔۔ یہاں ذرا ذرا سی ضرورت کے لیے اپنا پیسہ چاہیے سعدیہ بیگم۔

وہ سہم جاتی۔۔۔ دیس پرایا تھا۔۔۔ ساتھی تو اپنا تھا، چاہے چار گھنٹے کے لیے سہی۔۔۔ وہ چپ ہو جاتی۔۔۔ ہزار ہمت باندھنے پر بھی نہ کہہ پاتی۔۔۔ کہ اتنا تو پیسہ ہے۔۔۔ مگر جب تنہائی کا جان لیوا احساس اس کی جان کو آتا اور وہ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے کے مصداق شکوے شکایت پر منہ پھلا کر بتی بجھا کر سو جاتا۔۔۔ اور وہ بھیک میں ملے ہو چند گھنٹوں کی بےقدری پر باتھ روم میں جا کر گھٹ گھٹ کر روتی۔

رات گئے تک رونے پیٹنے کی وجہ سے اس کی صبح آنکھ ہی نہ کھل پاتی۔

تب وہ صبح اس کے پاؤں کا انگوٹھا ہلا کر اٹھاتا۔ یہ اس کی خفگی کا واضح اظہار ہوتا۔۔۔ تب وہ آنکھیں کھول کر جگانے والے کی طرف دیکھتی اور ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتی۔۔۔ کیونکہ وہ آفس جانے کے لئے بالکل تیار ہوتا بریف کیس اٹھا۔

دروازہ بند کر لو۔ اسے جاگتا دیکھ کر وہ کہتا ہوا بیرونی دروازے کی سمت بڑھ جاتا۔

اور وہ ننگے پاؤں اس کے پیچھے چلی آتی۔۔۔ وہ سنیں۔۔۔ ناشتا۔۔۔ کر لیا ہے میں نے۔۔۔ تیار کرنا آتا ہے مجھے۔ اور وہ چہرے سے ملال ہٹا کر بناوٹی بشاشت چہرے پر لا کر اسے سنتی رہتی۔۔۔ گویا باور کرانا چاہتی ہو کہ بھلا وہ کوئی ناراض تھوڑا ہی ہے بس یونہی آنکھ نہیں کھلی۔ مگر دروازہ بند کر کے اپنے آپ کو پیٹنے کو جی چاہتا۔

کیا قیامت ہے۔۔۔ خفا بھی نہیں ہو سکتے۔۔۔ کھل کر رو بھی نہیں سکتے۔ اسے اپنا آپ یکسر مظلوم دکھائی دیتا۔۔۔ تب ناشتے کے بعد پاکستان فون کرنے کی تیاری کرنے لگتی۔

آج وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔

سعدیہ طاہر اپنے گھر شادی کی خوشی میں پارٹی دے رہا ہے۔ شادی میں تو تم شریک نہیں تھی۔۔۔ اس نے اور اس کی بیوی نے بہت اصرار کیا ہے کہ تم پارٹی میں ضرور شریک ہو۔

ابھی گزشتہ ہفتے اس کے دوست طاہر نے ایک امریکی لڑکی ڈورتھی سیموئیل کو مسلمان کر کے شادی کی تھی مگر اس روز اس کی طبیعت خراب سی تھی اس لیے وہ تنہا ہی چلا گیا تھا۔

کیوں چلو گی نا؟ وہ کبھی جبر نہیں کرتا تھا۔

جی ضرور۔

تو چلو آؤ تمہیں کچھ جیولری دلا لائیں۔

میرے پاس کافی جیولری ہے۔

اب تم پاکستانی گنوار عورتوں کی طرف ست لڑے اور چمپ کلی پہن کر ان اسٹینڈرڈ پارٹیز میں شرکت کرو گی؟ اس کا موڈ ایک دم آف ہو گیا۔

اور اس کے منہ سے مشرقی زیورات کے نہایت جلے بھنے انداز میں نام لینے پر ہنسی تو بہت آئی مگر اس نے ضبط کر لیا۔

میں نے تو ایسے ہی کہہ دیا تھا۔ چلیں، میں تیار ہوتی ہوں، ابھی چلنا ہے ناں؟ وہ مصالحانہ انداز میں بولی۔

اور وہ اسے ایک عالیشان زیورات کی دکان پر لے گیا، نہایت ماہرانہ انداز میں پتھروں کو پرکھ رہا تھا اور ساتھ ہی دعوت دے رہا تھا کہ وہ پسند کرے۔

تب اس نے ایک نہایت نازک سا سیٹ پسند کیا۔ جس میں سرخ نگوں کی بہتات تھی جو نگ نہیں یاقوت تھے۔ اس نے اس کی پسند کو سراہا۔۔۔ اور جب وہ ادائیگی کر رہا تھا تب وہ چکرا کر رہ گئی، اس سیٹ کی مالیت لاکھ سے اوپر تھی مگر اس نے اس طرح ادائیگی کی جس طرح وہ آئس کریم خریدتی تھی۔

ارے، یہ تو بہت مہنگا ہے۔ اس نے میاں کے تاثرات جاننا چاہے اور اس کی سمت دیکھا بھی، کہیں وہ اتنی مہنگی پسند پر جھنجھلا تو نہیں گیا۔

زیورات تو ہوتے ہی مہنگے ہیں۔۔۔ رہی پیسے کی بات تو سبھی کچھ تمہارا ہے۔ وہ آج بہت خوشگوار موڈ میں تھا۔

اور وہ شرمندہ ہو کر سوچنے لگی۔

ہر انسان کی اپنی عادت ہوتی ہے۔ میں ان کی سنجیدہ طبیعت پر خواہ مخواہ سوچنے لگ جاتی ہوں۔۔۔ مرد تو عورت کو اپنی سانسوں کی مہک سے لوٹ لیتا ہے کجا یہ قاتل انداز باتیں۔ وہ مان گئی، ہلکی پھلکی ہو گئی۔

پھر وہ نہایت اہتمام سے تیار ہوئی بڑے دل سے بڑی چاہ سے۔

تقریب میں کافی پاکستانی، ہندوستانی جوڑے تھے۔ اس نے اپنے ڈھیر سارے انگریز دوستوں سے ان کا تعرف کرایا۔۔۔ ایک سرخ داڑھی، سرخ بالوں والا انگریز فہد کا ہاتھ تھام کر ایک کونے میں لگی میز پر لے گیا۔۔۔ فہد جاتے جاتے اسے اپنی چند انگریز سہیلیوں کے حوالے کر گیا۔ تقریب کے اختتام تک وہ بوڑھا اس کے ساتھ چپکا رہا۔

تین ماہ بعد وہ ایک ہفتے کے لیے وطن آئے۔

اپنے وطن کی سرزمین دیکھتے ہوا اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ایئر پورٹ کی عمارت پر نگاہ پڑتے ہی اسے ایسا لگا جیسے وہ ماں کی گرم آغوش میں آ گئی ہو۔ گو کہ انجانے لوگ تھے مگر شناسا سا لگ رہے تھے۔۔۔ اپنے لگ رہے تھے۔ اس کا دل چاہا فہد کو اپنا فیصلہ سنا دے کہ اب وہ مشینی ملک نہیں جا گی۔ جہاں سرد مشینی لوگوں کا راج ہے۔

وہ اجاڑ سونا فلیٹ۔۔۔ تنہائی ہے۔۔۔ اور یہاں کی راتیں بھی سہانی۔۔ اس کی آنکھوں سے قطرے ٹپک گئے۔

فہد نے چونک کر دیکھا۔ کیا بات ہے؟ میں۔۔۔ میں۔۔۔ بہت خوش ہوں۔ اس نے سچ اگل دیا۔

واٹ نان سنس کہتے ہو فہد نے بیلٹ کھولا اور بولا۔

تم میرا بریف کیس اٹھالو۔ خود اس نے سوٹ کیس اٹھا لیے۔ ٹرالی شاید کوئی فارغ نہیں تھے اور وہ جلدی میں لگتا تھا۔ اس نے بریف کیس اٹھایا تو لڑکھڑا گئی، ایک سوٹ کیس جتنا وزن تھا۔

روانگی سے قبل اس نے گھر فون کر دیا تھا۔

ایئرپورٹ پر اس کی نند رخسانہ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ موجود تھی۔

اپنوں کی مہک سے اس کے جذبات بھر بھر آ رہے تھے مگر وہ میاں کے خیال سے خود پر قابو رکھ رہی تھی۔

رخسانہ سے گلے مل کر آنکھوں میں آنسو امڈ آتے تھے۔

ارے بھابی آپ تو بالکل پری بن کر آئی ہیں۔ وہ اس کے دودھیا ہاتھوں کو فرط شوق سے دبا کر بولی۔

بڑے چچا بھی کراچی میں مقیم تھے۔ وہ کسٹم میں ملازم تھے، سامان کی چیکنگ کے دوران ان سے ملاقات ہو گئی تھی۔ وہ اب عمارت کے باہر بھی ہمراہ تھے۔

دو دن رخسانہ کے ہاں قیام کے بعد وہ اسلام آباد چلے گئے۔ چار دن میں تو ابھی آنکھ سے ملن کے آنسو بھی خشک نہ ہوتے تھے کہ روانگی کا دن بھی آ گیا۔۔۔ اسے اپنے عالیشان سجے سجا فلیٹ کے خیال سے ہی جھرجھری آ گئی وہ شاید جان گیا تھا، تب ہی کہا۔

تم رہنا چاہتی ہو تو رہ جاؤ، بعد میں آ جانا۔ اس نے ہر تاثر سے عاری چہرے کی سمت دیکھا۔

اسے معلوم تھا اس کا مطلب کیا ہے،

اس بار اس کے مزاج میں زیادہ سلجھاؤ پیدا ہو گیا تھا وہ اپنے حوصلے سے چلی آئی پھر اس نے تین چکر سال میں تنہا لگا۔۔۔ کہ وہ اس قدر فالتو نہیں کہ بھاگ بھاگ کر پاکستان جا۔ اسے بیوی کے احساسات کی کیا خبر تھی جو دھرتی ماں کی آغوش کو ہی سب کچھ سمجھتی تھی یاقوت، ہیرے اور جواہرات سے زیادہ۔۔۔ اور اب تو وہ عادی ہو گئی تھی۔ دوسری مرتبہ جب وہ تنہا جا رہی تھی، تب فہد نے اسے ایک ٹھوس سیاہ چھوٹا سا بکس دیا۔

اسے حفاظت سے لے جانا۔ اس میں چند مائیکرو فلمیں ہیں ہمارے بزنس سے متعلق۔ کراچی ایئرپورٹ پر تمہارے چچا تو ہوں گے۔ اس کی حفاظت کرنا نہایت حساس چیز ہوتی ہے۔ رخسانہ کے گھر عطاالرحمن نامی شخص جو ہماری کمپنی کا ڈائریکٹر ہے آ گا، اس کے حوالے کر دینا اور یہ کاغذات ہیں، وہ ان پر سائن کرے گا ان کاغذات کی حفاظت اپنے زیورات سے زیادہ سمجھ کر کرنا۔ وہ اسے اس طرح سمجھا رہا تھا جیسے وہ اسکول کی کام چور اکتائی ہوئی بچی ہو۔

انہیں اچھالتی نہ پھرنا۔۔۔ ذرا سی رگڑ سے یہ چیز خراب ہو جاتی ہے۔ میں اپنا سوٹ کیس

دے رہا ہوں جس میں یہ حفاظت سے رکھی جاسکتی ہیں۔ تم اپنا سامان بھی اس میں ہی ڈال لو۔ اب تو اس کی گود میں سنہری بالوں اور نیلی آنکھوں والی بیٹی بھی آگئی تھی۔ وہ اس میں مصروف ہوگئی تھی، اب تو اگر دو چار ماہ ہو جاتے تو وہ خود ہی کہتا تھا۔

کیوں بھئی، کیا پاکستان جانے کا ارادہ نہیں ہے؟

لو خوش ہو جاؤ، تمہاری بکنگ کرا دیتا ہوں۔۔ بولو کب جاؤ گی؟

تب وہ خوش ہو کر تاریخ کا تعین کر دیتی۔

اور پھر وہ اسے سیاہ چھوٹا سا بکس بھی دیتا۔

یہ آپ میرے ہاتھ ہی کیوں بھجواتے ہیں؟ اس کام کے لیے اتنا بڑا ادارہ کوئی دوسرا ملازم نہیں رکھ سکتا؟ اس نے جھنجھلا کر یا اکتا کر یہ بات نہیں کی تھی۔ بس اپنی متجسس فطرت کے موجب چلتے چلتے سوال کر ڈالا تھا۔

تب اس نے دیکھا، میاں صاحب کی تیوری پر بل پڑ گئے۔

کیا ہاتھی جتنا وزن ہے؟ رہنے دو اگر تم سے یہ نہیں ہوتا۔

میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ وہ اس کی بات سنبھلتے ہو بولی۔

یہ میرے مفاد کا کام ہے۔ اس کام میں مجھے سب سے زیادہ منافع ملتا ہے۔

کیا یہ آفس کا کام نہیں؟ اس نے سوال کر دیا۔

ہے تو آفس ہی کا۔۔۔ مگر تم نے اوور ٹائم کا نام سنا ہوگا تم۔ اسے اوور ٹائم سمجھ لو۔ اور خدا کے لیے آئندہ میرا دماغ نہ کھانا۔ یہ جملہ اس نے انگریزی میں کہا تھا۔ تب وہ خاموش ہو کر رہ گئی۔ اس مرتبہ فہد کی مس کے پرزور اصرار پر کہ وہ عید یہیں کریں، وہ ہفتے بھر کے لیے چلے آئے تھے۔

اسی دم جمال بھائی کی شادی کا ہنگامہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے شوہر سے ایک ماہ رہنے کی اجازت طلب کی جو بلا تامل مل گئی۔ وہ تو اپنی چھٹیاں ختم ہونے سے پہلے ہی روانہ ہو گیا تھا۔

اتنے عرصے کے بعد وہ خاندان کے ساتھ کوئی بڑی تقریب منا رہی تھی۔ بہت خوش تھی، ہر ہفتے میں دو مرتبہ فون کر لیتی تھی۔ جانتی تھی کہ وہ مشینی آدمی اسے کسی طور فون نہ کرے گا۔

اس نے دو خط بھی تحریر کیے تھے جن کی سعدیہ کو کوئی اطلاع نہ تھی آیا ملے کہ نہیں، جسے فون کرنے کی فرصت نہ تھی، وہ بھلا خط کیوں کر لکھتا۔ مگر اس مرتبہ حیران کن بات تھی کہ اس نے خود فون کر کے اس کی اور بیٹی کی خیریت دریافت کی تھی۔ وہ اس شخص کی عادی ہو چکی تھی۔ کوئی گلہ نہ تھا کوئی شکوہ نہ تھا اس سے۔ اس نے تار بھیج کر اطلاع دے دی تھی کہ فلاں تاریخ کو آ رہی ہے۔ تار بھیجنے کی نوبت اس لیے آئی کہ تین چار فون کیے گھر بھی اور آفس بھی مگر اس کا ایک فون بھی ریسیو نہیں کیا گیا۔ اس صورتحال سے وہ اور پریشان تھا۔

رومی سال بھر کی تھی۔ وہ اس کے انتظار میں تھی۔ رومی بھاگی پھر رہی تھی۔ وہ از حد کوفت میں مبتلا ہو گئی تھی۔

اونہہ یہ میں ہی تھی جو اس شخص کے ساتھ گزارہ کر لیا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتی تو دن میں تارے

دکھا دیتی۔ کوئی پرواہی نہیں تمہاری، حد ہے کوئی۔۔۔ آج گڑوں کی اچھی طرح کسائی۔ بہت ہو لیا۔ کافی دیر تک انتظار کے بعد وہ ٹیکسی کر کے گھر چلی آئی۔ فلیٹ کی دوسری چابی اس کے پاس تھی۔ فلیٹ میں داخل ہوتے ہی ایسا لگا جیسے وہ زلزلے سے تباہ حال بستی میں آ گھسی ہو۔

وارڈروب سے کپڑے باہر لٹک رہے تھے۔ دونوں پٹ کھلے تھے۔ لاکر کی تمام درازیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ کونا کونا الٹ پلٹ تھا۔ یہاں تک کہ باتھ روم کے شیشے تک اتار کر اوندھے منہ رکھے ہوئے تھے۔ رومی ذرا سی بچی تک حیران پریشان تھی، تب وہ سسک پڑی۔

اتنی بےپروائی فہد تمہاری ساری محنت آج چلی گئی۔ اف میرا گھر تو لٹ گیا فہد۔۔۔

فہد کے آفس فون کیا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک ماہ سے غیر حاضر ہے اور تین دن بعد اس کی ملازمت خود بخود ہی ختم ہو جائے گی۔

روتے روتے اسے خیال آیا کہ پولیس اسٹیشن فون کرے اس نے پولیس اسٹیشن فون کیا۔ اور نیچے انڈین فیملی رہتی تھی جس کے ساتھ اس کے دوستانہ مراسم تھے، وہ وہاں چلی گئی۔

مم۔۔۔ میرے فلیٹ میں چوری ہو گئی آنند بھائی۔ وہ پھر رو پڑی۔ میں نے پولیس اسٹیشن بھی فون کر دیا ہے۔۔۔ پولیس آنے والی ہے۔ آپ میرے ساتھ اوپر چلیں۔

مسز فہد آپ کے گھر چوری نہیں ہوئی۔۔۔

آپ چل کر تو دیکھیں، واقعی چوری ہوئی ہے۔ وہ آنند بھائی کی بات کاٹ کر بولی۔

میں کہہ رہا ہوں ناں۔۔۔ آپ کے فلیٹ میں چوری نہیں ہوئی بلکہ تین ہفتے قبل آپ کے فلیٹ میں پولیس آئی تھی۔

پو۔۔۔ لیس۔۔۔ پولیس۔ وہ تیرا کر گرنے لگی۔ آنند کی بیوی آشا نے اسے تھاما۔ آپ کے شوہر پر قیمتی پتھر اسمگل کرنے کا الزام ہے۔ اس نے اتنا سنا اور ہوش کھو کر آشا کی بانہوں میں جھول گئی۔

وہ چار گھنٹے بیہوش رہی۔ اسی دوران پولیس بھی آئی تھی تب آنند نے پولیس کو بتایا کہ گزشتہ دنوں فلیٹ نمبر 32 کے باسی پاکستانی فہد عثمان کی گرفتاری عمل میں آئی تھی۔ ان کی بیوی اس بات سے لاعلم ہیں اور آج ہی پاکستان سے لوٹی ہیں۔ وہ سمجھیں کہ ان کے فلیٹ میں چوری ہوئی ہے۔ پولیس کی واپسی کے کافی وقت گزرنے کے بعد وہ ہوش میں آئی۔ دونوں میاں بیوی اور ان کی بڑی بیٹی اسے تسلی دینے لگے۔۔۔ مگر اس کے آنسو نہ تھم رہے تھے۔ پردیس میں تنہا لڑکی۔۔۔ کوئی اپنا نہیں۔۔۔ کیسا اندھیر تھا۔ آنند بھائی نے وعدہ کیا کہ وہ فہد کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے۔ تب وہ لٹی پٹی اپنے فلیٹ میں چلی آئی۔ رومی آشا بھابی کے پاس تھی۔۔۔

وہ بکھری ہوئی چیزوں کے پاس بیٹھ کر خالی خالی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی چاروں طرف تم نے مجھے ذلیل ہی نہیں کیا فہد۔۔۔ دیکھو۔۔۔ دو اجنبی دیس کے باسی اب میرے وطن کے لوگوں کے بارے میں کیا کہیں گے۔ وہ بھی پرائے ہیں جو تمہیں یہاں سے لے گئے ہیں۔ یہ بھی غیر ہیں جو میری دلجوئی کر رہے ہیں

آنند اور آشا نے اس کی نہایت مخلصانہ مدد کی۔ انہی کی کوششوں کی بدولت آج وہ فہد کے سامنے کھڑی تھی۔

اس کا رواں رواں رو رہا تھا۔

یہ آپ نے کیا کیا فہد۔۔۔ وہ تڑپ کر رو دی۔۔۔ اس کا شیر کتنی بےبسی کی حالت میں تھا۔

مجھ پر محض الزام ہے۔۔۔ تم فکر نہ کرو۔۔۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔ بس ایک کام کرنا اس حادثے کی اطلاع پاکستان میں نہ دینا۔۔۔ چند دنوں بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔ تم فکر نہ کرو۔

لو بھلا، میں اپنی چادو آپ نوچ پھینکوں گی؟ اس نے روپی کو دوسرے شانے پر ٹکاتے ہوئے دکھ سے سوچا۔

فہد۔۔۔ کیا واقعی یہ آپ پر الزام جھوٹا ہے؟

ہاں۔

کب تک معاملہ ٹھیک ہو جائے گا؟

بہت جلد۔۔۔

انشا اللہ۔ اس نے منہ میں ہی کہا۔

مگر خدشات سے اس کا دل لرزنے لگا۔۔۔ کیونکہ اس نے جیل میں سرخ بالوں، سرخ داڑھی والے بوڑھے انگریز کو بھی دیکھا تھا۔

اور بہت جلد فیصلہ ہو گیا۔ جرم ثابت ہو گیا تھا کہ پولیس تو شکاگو ایئرپورٹ سے فہد کے تعاقب میں لگ چکی تھی۔ ہر ثبوت نہایت واضح اور مدلل تھا۔۔۔ جب اسے معلوم ہوا کہ فہد سات آٹھ برس اب آسمان کو ترسے گا تو وہ چکرا کر بیہوش ہو گئی۔۔۔ کہ وہ اس پرادیس میں کہاں تک وفاداری نباہے گی۔ صرف اپنے چند مفاد، اپنے چند فضول جذبوں کی خاطر، لوگ اس قدر گر جاتے ہیں کہ جو بےقصور ہوتے ہیں وہ ان سے زیادہ بامشقت سزا اٹھاتے ہیں۔

آج وہ پھر اس کے سامنے کھڑی ہوئی تھی مگر اسے بےبسی سے سر ڈالے دیکھ کر رواں رواں بین کرنے لگا رہی سہی کسر اس کی باتوں نے پوری کر دی۔

سعدیہ درحقیقت تم ایک عظیم عورت ہو۔۔۔ آج ہی نہیں میں تو کبھی بھی تمہارے قابل نہ تھا۔ تم پاکستان واپس چلی جاؤ۔۔۔ اگر تم چاہو تو میں تمہیں آزاد کر دوں گا۔۔۔ تم کسی ایسے شخص کا دامن تھام لینا۔۔۔ جو تمہارے احساسات کا مالک ہو۔ وطن دوست ہو۔

پلیز فہد، خاموش ہو جائیں۔ وہ آنسو بہانے لگی۔ وطن یاد آیا تو کلیجے پر چوٹ لگی دیکھو تو بھلا سزا سے سزا تک کا سفر۔

اب تو میری جان بخش دو۔۔۔ اب تو میری جان پر رحم کرو، یہ عورت کا دل ہے فہد۔۔۔ ایسا کتبہ جس پر رنگ پھیر کے نیا نام نہیں لکھا جاتا۔۔۔

میں۔۔۔ انتظار کی مالا جپوں گی۔۔۔ تنہائی۔۔۔ کی بھٹی میں جلوں گی مگر تمہاری رہوں گی کہ میری سرشت میں تو ہے ہی وفاداری۔۔۔ مگر آج میں تم سے چند وعدے لوں گی۔۔۔ آج

تمہیں میری بہت کچھ سننا پڑے گی۔ آج میرا وقت جاوی ہے میں اسے ضائع نہیں جانے دوں گی۔۔۔ اس نے سلاخوں پر رکھے فہد کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔

فہد۔۔۔ جب آپ یہاں سے نکلیں گے تو ہم اپنے وطن میں رہیں گے۔۔۔ میں انتظار کروں گی۔ آپ نے اتنی بڑی بات کہہ کر میری شدید توہین کی ہے۔۔۔ فہد میری مٹی میں فقط وفاداری ہے۔۔۔ یہ آپ نے کیا کہہ دیا؟

فہد لوگ۔۔۔ مردہ ضمیر کا چٹانوں سا وزن اٹھا کر جی لیتے ہیں۔۔۔ میں کیا انتظار کی خاک بھی نہ اٹھا سکوں گی؟ وہ نہ چاہتے ہوبھی چوٹ کر گئی تھی۔

اسے کبھی بیموقع بات کہنے کی عادت نہیں تھی، یہ بات اس نے موقع ہی سے کہی تھی۔۔۔ فہد کا جھکا سر۔۔۔ مزید جھک گیا۔

آپ تو میری بیٹی کے باپ ہیں۔ مگر فہد ایک بات ہے۔ اس نے جیل کے چکنے فرش والے برآمدے میں سرخ فراک میں ملبوس سنہری بالوں والی (جن کو دو حصوں میں بانٹ کر پونیاں بندھی ہوئی تھیں) ڈیڑھ سال کی بیٹی کو اچھلتے کودتے دیکھا۔ آپ نے کبھی سوچا۔

کہ ستم آپ جیسے لوگ ڈھاتے ہیں۔۔۔

اور

روگ ماؤں کو لگ جاتے ہیں۔

The End ---------------------- اختتام